POSTED AT LPC Delhi RMS
ON 24-25 MAY 2025, R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) - 01/1195/2024-26, Licensed to Post
Without Prepayment U (C) - 160/2024-26, ISSN 2456-8511

Total Pages
8

HAMARI
ZABAN
(Weekly)

ہفت روزہ
ہماری زبان

اشاعت کا 86واں سال

Date of Publication: 23-05-2025 • Price: 5/- • 1-7 June 2025 • Issue: 21 • Vol:84

یکم تا ۷رجون ۲۰۲۵ء • شمارہ:۲۱ • جلد:۸۴

پہلی قسط

لالہ بہاری لال

تھومسن سِول انجینئر نگ کالج (موجودہ آئی آئی ٹی رڑکی) کے گمنام مترجم

ساجد صدیق نظامی

اس عام خیال کے باوجود کہ اردو زبان میں سائنسی مضامین بالعموم بیان نہیں ہو سکتے، یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ متفرق سائنسی موضوعات کو یوروپی زبانوں سے اردو زبان میں منتقل کرنے کے حوالے سے متعدد کوششیں اٹھارھویں صدی کی تیسری ہی دہائی میں شروع ہو گئی تھیں۔ یہ مساعی نجی طور پر مختلف افراد کی جانب سے ظہور میں آئیں اور ادارہ جاتی سطح پر یا سرکاری سرپرستی میں بھی ان کی داغ بیل ڈالی گئی۔

اس سلسلے کے آغاز میں سب سے نمایاں نام نواب شمس الامرا کا ہے۔ 1834 میں حیدر آباد دکن میں نواب شمس الامرا کی سرپرستی میں 'دارالترجمہ' کی بنیاد رکھی گئی۔ جہاں ریاضی، طبیعات، کیمیا، علم الادویہ، جیومیٹری، فلکیات اور دیگر علوم پر مختلف کتب یورپی زبانوں سے اردو میں ترجمہ کی گئیں۔ شمس الامرا نے اس مقصد کے لیے چند یوروپی فاضلین کو بہ طورِ خاص ملازم رکھا تھا۔ نیز انھوں نے 'مدرسہ فخریہ' بھی قائم کیا تھا جہاں طب کی تعلیم سائنسی بنیادوں پر دی جاتی تھی۔ (شاہد، ص63 تا71)

اسی دور میں لکھنؤ میں نصیر الدین حیدر کی سرپرستی میں سائنسی علوم سے متعلق چند کتب انگریزی سے اردو میں منتقل ہوئیں۔ سیموئل جانسن کے معروف انگریزی ناول The History of Rasselas, Prince of Abissinia کو اردو میں 'تواریخ راسلس' کے عنوان سے منتقل کرنے والے کمال الدین حیدر عرف محمد میر لکھنوی نے بھی اس دور میں سائنسی موضوعات پر تقریباً اٹھارہ کتب کو اردو میں منتقل کیا۔ (شکیل، ص67 تا81)

دہلی کالج اور 1843 میں قائم ہونے والی 'دلّی ٹرانسلیشن سوسائٹی' کی خدمات بھی اس حوالے سے بہت نمایاں ہیں۔ کالج اور سوسائٹی کے زیرِ اہتمام متنوع علوم پر تقریباً سوا سو کتب ترجمہ کی گئیں، جن میں نمایاں تعداد سائنسی کتب کی تھی۔ سوسائٹی کے کارپرداز اس حوالے سے خاصے روشن خیال ثابت ہوئے کہ اس زمانے میں انھوں نے یوروپی زبانوں سے اردو میں ترجمے کے جو اصول وضع کیے تھے، بڑی حد تک آج بھی غیر متعلق نہیں ہوئے ہیں۔ مزید تفصیلات بالترتیب مولوی عبدالحق اور مالک رام کی تصانیف 'مرحوم دہلی کالج' (ص 124 تا 131) اور 'قدیم دلی کالج' (ص44 تا46) میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

انیسویں صدی کے نصف اول میں انھیں اداروں میں ایک نام 'تھومسن انجینئر نگ کالج، رڑکی' (پہلا نام: سول انجینئر نگ کالج، رُڑکی) کا بھی ہے۔ رڑکی، سہارن پور اور ہری دوار کے قریب ایک شہر ہے، جو اُس وقت شمال مغربی صوبے یا اتر پردیش کا حصہ تھا۔ آج کل رڑکی، ہندستانی ریاست اتراکھنڈ کا حصہ ہے۔

اس کالج کے قیام 1847 سے لے کر قیاساً 1870 تک ہندستانی باشندوں کو انجینئر نگ اور سول ورکس (Civil Works) کی جملہ تعلیم اردو زبان میں دی جاتی رہی۔ اس ادارے میں اردو زبان میں تالیف و ترجمہ ہونے والی سول Civil انجینئر نگ سے متعلق فنی و تکنیکی موضوعات پر چونتیس کتب ہیں جن کا نام پتا مل جاتا ہے۔ یوں بھی اردو زبان میں سول انجینئر نگ سے متعلقہ فنّی و تکنیکی مضامین کے بیان کی طرف توجہ بہت کم رہی ہے۔ جامعہ عثمانیہ سے قبل اس میدان میں صرف یہی کالج نظر آتا ہے۔ اس کالج کی خدمات کو بھی منہا کر دیں تو تہی دستی ہاتھ آتی ہے۔

پہلے تھومسن انجینئر نگ کالج، رڑکی کے قیام کے پس منظر کو جان لینا ضروری ہے۔ دوسری اینگلو مراٹھا جنگ (1803-05) سے لے کر دوسری جنگِ پنجاب 1849 کے خاتمے پر یہ امر بدیہی طور پہ متبادر ہو چکا تھا کہ اب ہندستان کا حقیقی حکمران کون ہوگا؟ اس عرصے میں انگریز شمال مغربی صوبہ جات (اُتر پردیش)، صوبہ جاتِ وسطی (مدھیہ پردیش)، بہار، مہاراشٹر، گجرات، راجستھان، سندھ، بلوچستان، شمال مغربی سرحدی صوبے (خیبر پختونخواہ) پر بلاواسطہ یا بالواسطہ متصرف ہو چکے تھے۔ ان علاقوں پر سیاسی لحاظ سے غلبہ برقرار رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ یہاں کے قدرتی وسائل (مثلاً دریاؤں، زرخیز زمینوں، زرعی پیداوار وغیرہ) سے حتی المقدور فائدہ اٹھایا جائے۔ دوم یہ کہ یہاں پہ عمومی ترقیاتی کاموں کا جال سا بچھا دیا جائے جیسے کہ پہلے سے موجود سڑکوں کو ترقی دی جائے، نئی سڑکیں اور راستے بنائے جائیں، ریلوے ٹریک بچھائے جائیں، تار (ٹیلی گراف) کا نظام قائم کیا جائے وغیرہ۔ اس حکمتِ عملی کا انھیں دوہرا فائدہ یوں ہونا تھا کہ جہاں یہ کام ہندستانی باشندوں کی نظر میں ان کی قدر بڑھاتے، وہیں ان سب علاقوں میں انگریز سپاہ کی بآسانی نقل وحمل اور دور دراز کے علاقوں تک ان کی رسائی کو ممکن بناتے۔ یوں انگریزی اقتدار کی قوتِ نافذہ میں اضافہ ہوتا۔

ان امور کے ساتھ ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی کی انتظامیہ گنگا اور جمنا سے منسلک آب پاشی کے نظام کو بھی ترقی دے رہی تھی۔ مثلاً جمنا کے مغربی کنارے سے 1817 میں اور مشرقی کنارے سے 1822 میں نہریں جاری کی گئی تھیں۔ نیز دہرہ دون اور روہیل کھنڈ میں آب پاشی کا نظام قائم کرنے، دہلی شہر کو نجف گڑھ جھیل سے پانی کی فراہمی جیسے منصوبے بھی شروع کیے جا چکے تھے۔ اسی طرح انتظامیہ گنگا سے منسلک آب پاشی کا نظام جاری کرنے کی خواہش رکھتی تھی۔ لہٰذا ان مشکل اور طویل مدتی منصوبوں کے لیے بھی ماہر سول انجینئرز کی ضرورت تھی جو اس نوعیت کے کاموں کو تکمیل تک پہنچا سکیں۔

اوپر بیان کیے گئے تمام پبلک ورکس (Public Works) کے لیے افرادی قوت اور جدید تعلیم یافتہ لوگ انگلستان سے مہیا نہیں ہو سکتے تھے، لہٰذا ہندستان میں ہی ایسا ادارہ قائم کرنے کا خیال انتظامیہ کے ذہن میں آیا جہاں سول انجینئر نگ Civil Engineering کی تعلیم دی جا سکے۔

اس پس منظر کے ساتھ ساتھ اس امر کی طرف بھی دھیان دینا ضروری ہے کہ اس دور میں اشاعتِ تعلیم کے حوالے سے کمپنی کی عمومی پالیسی کیا تھی؟

1913 میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کافی بحث مباحثے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ کمپنی کے مقبوضات میں تعلیم کی اشاعت کی ذمہ داری کمپنی کی ہے۔ لیکن اس کی عملی صورت کیا ہو؟ مغربی علوم اور انگریزی زبان کی ترقی یا مقامی علوم اور مقامی زبانوں کی سرپرستی؟ ان دونوں صورتوں کی آمیزش یا کسی ایک کا غلبہ؟ یہ ایک دقت طلب اور مشکل موضوع تھا۔ اکثر اوقات متعلقہ انتظامی اہلکاروں کے ذاتی خیالات بھی اس نوعیت کی پالیسی پر اثر انداز ہوتے تھے۔

شمال مغربی صوبے کے اس وقت کے لیفٹیننٹ گورنر جیمز تھومسن (1843-53) اس بات کے مؤید تھے کہ مقامی لوگوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دی جائے۔ اس کے علاوہ، وہ تعلیمِ عامّہ کے بھی طرف دار تھے۔ (نوراللہ، ص124)

1843 میں شمال مغربی صوبے کے تعلیمی ادارے حکومتِ بنگال کے انتظام سے نکل کر صوبائی حکومت کے انتظام میں آ گئے۔ یوں تو اس

قارئین! اب 'ہماری زبان' کا مطالعہ انجمن ترقیِ اردو (ہند) کی ویب سائٹ www.atuh.org پر بھی کر سکتے ہیں جہاں اِسے مفت میں ڈاؤن لوڈ کرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔

اردو کی تواریخِ ادب میں تو شاید اس کالج کے تذکرے کی گنجائش نہ نکلے مگر اردو میں سائنسی ادب کے حوالے سے کام کرنے والے محققین نے بھی اس طرف زیادہ توجہ نہیں کی۔ خواجہ حمید الدین شاہد اور ڈاکٹر محمد شکیل خان نے اپنی تحقیقی کاوشوں میں قدرے وضاحتی انداز میں کالج کا ذکر کیا ہے۔ خواجہ حمید الدین شاہد کو اس ضمن میں اولیت حاصل ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے 'اردو میں سائنسی ادب' میں رڑکی کالج کی سات کتب کے بارے میں تعارفی شذرات لکھے۔ اگرچہ انھوں نے کالج کے آغاز، انتظامیہ، نصاب وغیرہ کے حوالے سے کوئی معلومات فراہم نہیں کیں۔ ان کے بعد محمد شکیل خاں نے اپنے پی ایچ۔ڈی کے مقالے 'اردو میں سائنسی و تکنیکی ادب' میں کالج سے متعلق باب قائم کیا۔ گو کہ انھوں نے خواجہ صاحب سے ایک قدم آگے بڑھ کر کالج کی بنیاد و آغاز کے بارے کچھ معلومات فراہم کیں لیکن ان معلومات میں سے بیش تر درست نہیں تھیں۔ مثلاً انھوں نے 'ہندی وشوکوش'، جلد دہم کے حوالے سے لکھا ہے کہ کالج میں تدریس کے آغاز پر صرف انگریز طلبہ ہی داخل کیے گئے اور ذریعۂ تعلیم بھی انگریزی ہی رکھا گیا۔ نیز کالج کے تیئیسویں سال 1870 میں ہندستانی طلبہ بھی تدریس میں شریک کیے جانے لگے۔

وقت شمال مغربی صوبے میں انگریزوں کے زیرِ انتظام تین کالج (دہلی کالج، آگرہ کالج، بنارس کالج) اور نو (9) اینگلو ورنیکلر اسکول تھے، مگر فنّی اور تکنیکی تعلیم کے لیے مخصوص ادارہ کوئی نہیں تھا۔

لہٰذا سول انجینئر نگ کی تعلیم کے لیے مخصوص ادارے کے قیام کی تجویز کو صائب جانتے ہوئے لیفٹیننٹ گورنر (شمال مغربی صوبہ جات) نے 19 اکتوبر 1847 کو لیفٹیننٹ آر میکلیگن (R Maclagan) کو اس ادارے کا پرنسپل مقرر کیا۔ اور 25 نومبر 1847 کو نوٹیفکیشن نمبر 949، از جنرل ڈیپارٹمنٹ، شمال مغربی صوبہ جات کے تحت کالج کے قیام کا اعلان کرتے ہوئے قواعد وضوابط پہ مشتمل تعارفی کتابچہ جاری کیا گیا۔ (اکاؤنٹ آف رڑکی کالج، ص5)

ابتدا میں کالج کا نام College for Civil Engineers, Roorkee رکھا گیا۔ کالج کا تعلیمی وانتظامی ڈھانچا اس طرح ترتیب دیا گیا کہ یوروپین اور مقامی طلبہ کو اس نقطۂ نظر سے سول انجینئر نگ کی نظری وعملی، ہر دو نوعیت کی تربیت دی جائے کہ وہ برطانوی مقبوضات میں جاری سول ورکس Civil Works کو اس تربیت کے ذریعے بہتر انداز میں مکمل کرسکیں۔

اس مقصد کے لیے کالج میں طلبہ کے تین زمرے قائم کیے گئے۔ ہر زمرے میں وظیفہ یاب/ مشاہرہ یافتہ طلبہ کی بھی معقول تعداد رکھی گئی۔ نیز ان طلبہ کو رہائش بھی فراہم کی گئی۔ ذیل میں کالج میں طلبہ کے مختلف درجات سے متعلق معلومات Account of the Present State of the College for Civil Engineers at Roorkee کے حوالے سے درج کی جارہی ہیں۔

پہلا زمرہ

اس زمرے کے طلبہ کو تعلیم کی تکمیل کے بعد سب اسسٹنٹ سول انجینئر تعینات کیا جاتا تھا۔ اس درجے میں داخلے کی حدِ عمر 22 سال رکھی گئی۔ نیز انگریزی زبان کا روانی سے پڑھنا، لکھنا اور بولنا ضروری خیال کیا گیا۔ اسی طرح انھیں جیومیٹری، پیمائش، الجبرا، Plane and Spherical Trignimetery، کونک سیکشن Conic Section اور مکینکس کی شدبد بھی ہونا ضروری تھی۔ اس زمرے میں وظیفہ یاب طلبہ کی تعداد 8 رکھی گئی جنھیں ہر میقات میں 40 روپے وظیفہ دیا جاتا تھا۔ نیز یہ بھی طے کیا گیا کہ اگر کوئی طالب علم کسی اور سرکاری کالج سے منسلک نہ ہوا تو اسے وظیفے کے ساتھ مفت رہائش گاہ بھی دی جائے گی۔

امیدوار طلبہ کو اِن وظائف کے حصول کے لیے پرنسپل رُڑکی کالج کے نام درخواست دینا ہوتا تھا جس کے ساتھ انگریز سپرنٹنڈنٹ انجینئرز، وسطی وشمال مغربی صوبہ جات کے ایگزیکٹو آفیسرز، پنجاب ڈویژن کے ایگزیکٹو آفیسرز، انہار اور سڑکوں Canal and Roads کے سپرنٹنڈنٹ اور ایگزیکٹو افسران یا آگرہ، بنارس اور دہلی کالج کے پرنسپل صاحبان میں سے کسی ایک کا تصدیقی سرٹیفکیٹ بھی منسلک کرنا ہوتا تھا کہ یہ امیدوار وظیفہ یابی کی متعلقہ شرائط پر پورا اترتا ہے۔

دوسرا زمرہ

یہ درجہ یوروپین نان کمیشنڈ آفیسرز اور یوروپین سپاہیوں کے لیے مختص کیا گیا۔ اس درجے میں داخلے کے لیے امیدواروں کو داخلہ امتحان میں کامیابی حاصل کرنا ضروری تھی۔ اس کے علاوہ انگریزی میں قابلیت اور ارتھمیٹک Arithmetic، ایلیمنٹری جیومیٹری، پیمائش، سمپل پلان ڈرائنگ Simple Plan Drawing کی شدبد ہونی چاہیے تھی۔ مزید یہ کہ داخلے کے امیدواران کے پاس اپنے رجمنٹ یا کمپنی کے کمانڈنگ یا اسٹاف آفیسر کی جانب سے جاری کردہ کیریکٹر سرٹیفکیٹ بھی ہونا چاہیے تھا۔

پراسپیکٹس کے مطابق اس شعبے کے طالبِ علموں کی تعلیم اس نقطۂ نظر سے کی جاتی تھی کہ وہ بعد میں پبلک ورکس ڈپارٹمنٹ میں اوورسیئر کی ذمے داریاں نبھاسکیں۔ اس شعبے کے طالبِ علموں کو رُڑکی آمد کے سفری اخراجات بھی دیے جاتے تھے۔ پہلے چھے ماہ تک وہ آزمائشی مدت Probation Period میں رہتے تھے۔ اس دوران انھیں اپنی رجمنٹل تنخواہ اور کالج کی طرف سے رہائش بھی ملتی تھی۔ اس مدت کے بعد ان کی کارکردگی کے پیشِ نظر اگر منظور کیا جاتا تو انھیں اسسٹنٹ اوورسیئر کی تنخواہ ادا کی جاتی تھی اور وہ کالج میں اپنی تعلیم جاری رکھتے تھے۔ مناسب وقت پہ انھیں پبلک سروسز میں منتقل کردیا جاتا تھا۔

اس شعبے میں طلبہ کی تعداد 10 رکھی گئی۔

تیسرا زمرہ

تیسرا زمرہ ان دیسی/ مقامی نوجوانوں، جو سروینگ Surveying، لیولنگ Leveling اور پلان ڈرائنگ سیکھنا چاہیں، کے لیے قائم کیا گیا۔ مقامی طور پہ حاصل کی گئی ارتھمیٹک Arithmetic کی تعلیم اور فارسی حروف میں اردو پڑھنے اور لکھنے کی صلاحیت اس زمرے میں داخلے کے لیے ضروری تھی۔ آغاز میں اس درجے میں طلبہ کی تعداد 16 تک محدود کی گئی۔ ان طلبہ کے لیے 5 روپے فی میقات وظیفہ مقرر کیا گیا۔ نیز ان کے لیے مفت رہائش کا انتظام بھی کیا گیا۔

یہ بھی طے کیا گیا کہ ان زمرہ جات کے علاوہ اگر کوئی اس ادارے میں تعلیم حاصل کرنا چاہے گا تو اس سے معقول فیس لی جائے گی۔ ادارے میں سالانہ امتحانات ہوں گے اور تمام طلبہ کی قابلیت اور صلاحیت کے مطابق ان کی درجہ بندی کی جائے گی۔ نمایاں اور استحقاق رکھنے والے طلبہ کو انعامات میں کتب اور Mathematical Instruments دیے جائیں گے۔

سینئر ڈیپارٹمنٹ:

1854 میں درج بالا تین زمروں کے علاوہ ایک اور زمرے، سینئر ڈیپارٹمنٹ کا اضافہ کردیا گیا۔ اگرچہ 1852 میں اس زمرے کے قیام کی منظوری گورنر جنرل کونسل سے لے لی گئی تھی۔ اس زمرے کو رائل برٹش آرمی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی افواج کے کمیشنڈ آفیسرز کے لیے مختص کردیا گیا۔ اس زمرے میں داخلے کے لیے لیے جانے والے امتحان میں Surveying, Constructive and Mechanical Engineering, Algebra, Quadratic Equations کے مضامین اور اقلیدس کی پہلی چار کتب شامل تھیں۔

یکم جنوری 1848 سے کالج میں باقاعدہ داخلے شروع ہوئے۔ شروع میں داخلہ لینے والے طلبہ وہی تھے جو کالج کی تنظیم سے قبل میجر بیکر Maj. W. E. Baker، ڈائریکٹر جنرل Ganges Canal کے یہاں لیولنگ کی تعلیم حاصل کررہے تھے۔ اسی برس کے نصف تک کالج کی ضروری عمارات تعمیر ہوگئیں۔ نیز انتظامی نوعیت کے دیگر کام بھی مکمل ہوگئے اور سلسلۂ تعلّم شروع کردیا گیا۔ اگست 1848 تک دوسرے زمرے میں بھی طالبِ علموں کی مختص تعداد مکمل ہوگئی۔

'کالج کیلنڈر 1902' کے مطابق کمپنی کے بورڈ آف ڈائرکٹرز نے مراسلہ نمبر 6، بتاریخ 8 فروری 1854 کے تحت، جیمز تھومسن لیفٹیننٹ گورنر، شمال مغربی صوبہ، (جو 27 ستمبر 1853 کو بریلی میں ناگہانی وفات پاگئے تھے) کی رُڑکی کالج کی توسیع وترقی کے لیے خدمات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کالج کا نام تبدیل کرکے 'تھومسن کالج آف سول انجینئر نگ، رڑکی' رکھ دیا۔ جو بعد میں 'تھومسن سول انجینئر نگ کالج، رڑکی' کے نام سے مشہور ہوگیا۔ (ص10) 1864 میں کالج کو رسمی طور پر کلکتہ یونی ورسٹی سے منسلک کردیا گیا۔

1870 میں 'سینئر ڈیپارٹمنٹ' کا نام 'انجینئر کلاس' رکھ دیا گیا۔ اس میں ملٹری اور سول، دونوں طرح کے ذیلی زمرے شامل تھے۔ اسی طرح طلبہ کے دوسرے زمرے کا نام 'اپر سب آرڈینیٹ کلاس' Upper Subordinate Class جب کہ تیسرے زمرے کا نام 'لوئر سب آرڈینیٹ کلاس' Lower Subordinate Class رکھ دیا گیا۔

1870 کی دہائی میں کالج باقاعدہ طور پہ ہندستان میں سول انجینئر نگ کی تعلیم کا واحد نامور ادارہ بن گیا۔ ان دستاویزات سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کالج میں مقامی طلبہ کے لیے اردو ذریعۂ تعلیم کب تک برقرار رکھا گیا۔ البتہ 70-1869 کے بعد کالج میں تالیف وترجمہ ہونے والی کتب کا سراغ نہیں ملتا۔

تقسیم وآزادیِ ہند کے بعد 1949 میں کالج کو یونی ورسٹی کا درجہ دے دیا گیا۔ 2001 میں اس کا نام بدل کر Indian Institute of Technology, Roorkee رکھ دیا گیا۔ اس وقت اس کا شمار ہندستان میں انجینئر نگ کی تعلیم کے چند ایک بڑے اداروں میں ہوتا ہے۔

اردو کی تواریخ ادب میں تو شاید اس کالج کے تذکرے کی گنجائش نہ نکلے مگر اردو میں سائنسی ادب کے حوالے سے کام کرنے والے محققین نے بھی اس طرف زیادہ توجہ نہیں کی۔ خواجہ حمید الدین شاہد اور ڈاکٹر محمد شکیل خان نے اپنی تحقیقی کاوشوں میں قدرے وضاحتی انداز میں کالج کا ذکر کیا ہے۔

خواجہ حمید الدین شاہد کو اس ضمن میں اولیت حاصل ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے 'اردو میں سائنسی ادب' میں رڑکی کالج کی سات کتب کے بارے میں تعارفی شذرات لکھے۔ اگرچہ انھوں نے کالج کے آغاز، انتظامیہ، نصاب وغیرہ کے حوالے سے کوئی معلومات فراہم نہیں کیں۔ (ص 97-187)

ان کے بعد محمد شکیل خاں نے اپنے پی ایچ.ڈی کے مقالے 'اردو میں سائنسی وتکنیکی ادب' میں کالج سے متعلق باب قائم کیا۔ گو کہ انھوں نے خواجہ صاحب سے ایک قدم آگے بڑھ کر کالج کی بنیاد و آغاز کے بارے کچھ معلومات فراہم کیں لیکن ان معلومات میں سے بیش تر درست نہیں تھیں۔ مثلاً انھوں نے 'ہندی وشوکوش'، جلد دہم کے حوالے سے لکھا ہے کہ کالج میں تدریس کے آغاز پر صرف انگریز طلبہ ہی ... (بقیہ ص 7 پر)

ممتاز ادبی صحافی مدن لعل منچندہ

ڈاکٹر جی. آر. کنول

آخر مدن لعل منچندہ بھی یکم مئی 2021 کو جہانِ فانی سے رخصت ہوگئے۔ وہ ایک معروف ادبی صحافی تھے جو 1924 کو عالمِ وجود میں آئے۔ ان کا آبائی وطن پاکستان کے موجودہ ضلع راولپنڈی میں تھا۔ ان کا اصلی نام ایشورداس کے والد محترم کا تجویز کردہ تھا مگر بعد میں وہ اپنی موسی کی پسند کے مطابق 'مدن لعل' کہلائے اور تاحیات اسی نام کے حامل رہے۔ پس ماندگان میں ان کا بیٹا چندر موہن کچھ عرصہ پہلے وزارتِ دفاع سے سینئر سائنٹسٹ کے عہدے سے سبک دوش ہوا۔ دو بیٹیاں ہیں، ایک روسی زبان کی ماہر گیتا اور دوسری جنگ کماری میڈیکل ڈاکٹر ہیں۔

منچندہ صاحب کی تعلیم کا آغاز راولپنڈی کے سناتن دھرم ہائی اسکول میں ہوا، بعد میں یہی اسکول سناتن دھرم کالج بن گیا اور انھوں نے یہاں سے پنجاب یونی ورسٹی کا بی اے اردو آنرس کا امتحان پاس کیا۔ English Language Literature میں ایم اے کی ڈگری آزاد ہندستان میں ناگپور یونی ورسٹی سے حاصل کی۔

منچندہ صاحب نے اپنی ادبی صحافت کا آغاز اردو کی ان کہانیوں اور مضامین سے کیا جن کی اشاعت 'سشما'، 'بانو'، 'کھلونا' اور 'سفینہ' جیسے مقبولِ عام رسائل میں ہوتی تھی۔ بعد میں ان کی تحریریں نہایت معیاری جریدوں مثلاً 'آجکل'، 'ادبِ لطیف'، 'ندیم' اور 'افکار' کے صفحات کی زینت بنیں۔ انگریزی میں ان کے مختلف مضامین 'انڈین ایکسپریس'، 'ہندستان ٹائمز'، 'ٹائمز آف انڈیا'، پائنیر' اور 'آنند بازار پتریکا' وغیرہ میں پانچ دہائیوں تک چھپتے رہے۔ منچندہ صاحب کچھ عرصے تک Armed Forces Civilian Officer کے عہدے پر فائز رہے لیکن ان کا اصلی میدان ادبی صحافت تھا جس سے وہ کسی بھی حالت میں الگ ہونے کے لیے آمادہ نہیں تھے۔ ان کی کہانیوں کے مجموعے 'چراغِ آرزو' کے دیباچے مورخہ یکم جنوری 2008 میں جناب قیصر شمیم کے مطابق 'مدن لعل منچندہ اردو کے ادیب اور انگریزی کے صحافی ہیں۔ وہ ماہنامہ India See کے مدیر رہ چکے ہیں مگر اردو سے ان کا عشق ان سب پر حاوی ہے۔ وہ گذشتہ ساٹھ برسوں سے اردو کی خدمت کررہے ہیں۔ موجودہ مجموعے کی اشاعت بھی اردو سے ان کی وابستگی کا مظہر ہے۔ گو انگریزی میں ان کی اردو ادب سے متعلق ایک کتاب 'جدید اردو ادب کی جھلکیاں' شائع ہونے والی ہیں۔'

'چراغِ آرزو' میں کُل 21 کہانیاں ہیں، سب کی سب انسانی زندگی کے مختلف مسائل اور اس کی دائمی قدروں کی آئینہ دار ہیں۔ پیش ہے کہانی 'امتحان' سے ایک اقتباس:

'سریک جواب پر پنسل سے صحیح کا نشان لگا ہوا پایا۔ سبھی سوال ٹھیک تھے، لیکن آخر میں ایک بڑا اصفر کا نشان بنا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا لیکن فوراً ہی اسے یہ بات سوجھ گئی کہ ماسٹر صاحب صفر کے ساتھ پانچ جوڑنا بھول گئے۔ حقیقت میں اس کے پچاس نمبر تھے۔ سبھی سوال ٹھیک تھے۔ سریش اس غلطی کو صحیح کروانے کے لیے اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ اس کی نگاہ میں ذرا ہی نیچے لکھے ہوئے یہ الفاظ تھرانے لگے: یہ امتحان ریاضی کا نہیں آپ کی ایمانداری کا تھا۔ اشرف، جسونت، منوہر، پرکاش اور سبھی کے پرچوں پر بھی ایسے ہی لکھا تھا۔ مسکراہٹ جو ان کے چہروں پر کھل رہی تھی کافور ہوگئی اور ان کی ساری خوشی پر اوس پڑ گئی'۔

کہانیوں کے اس مجموعے کا ہندی اڈیشن 'دیپ آشاؤں کا' نام سے اور انگریزی اڈیشن Burning Lamp of the Desires کے نام سے جنوری 2020 میں چھپا اور ان دونوں کا مختصر پیش لفظ سابق نائب صدر جمہوریۂ ہند جناب ایم حامد انصاری نے لکھا۔ ان کے مطابق یہ کہانیاں جو پچھلی نسل کے قارئین کے لیے لکھی گئی تھیں، اب موجودہ نسل کے ہندی اور انگریزی داں قارئین کے مطالعے کا اہم حصہ بنیں گی۔

منچندہ صاحب کی دوسری کتاب 'کاروانِ اردو' ادبی اور سماجی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کے پیش لفظ میں سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر شنکر دیال شرما کی ایک تقریر ہے جس کا یہ اقتباس آج بھی دل چسپی کا باعث ہے:

''جب میں صدر جمہوریہ کے عہدے پر فائز تھا تو پاکستان کے سفیر کو واضح الفاظ میں بتایا تھا کہ اردو ہماری زبان ہے اور ہندستان کی دیگر زبانوں کے ساتھ اس کا مرتبہ برابر ہے اور آج پھر اس اسٹیج سے حاضرین (جن میں ہندو، مسلمان اور سکھ سبھی مذاہب کے لوگ شریک تھے) سے مخاطب ہوں کہ اردو کو زندہ رکھنے کی ذمے داری ہم سب کی ہے''۔

پیش لفظ میں مرکزی حکومت کے سابق وزیرِ قانون سلمان خورشید فرماتے ہیں: ''مجھے خوشی ہے کہ مدن لعل منچندہ ادب کی سماجی اہمیت کے حامی ہیں جو ادب کے تحرک کے بغیر ممکن نہیں۔ معاشرہ جن پیچیدگیوں کا حامل ہے وہی زندگی کے حسن سے عبارت ہیں اور ان پیچیدگیوں کا تجزیہ جناب مدن لعل منچندہ نے ژرف نگاہی سے کیا ہے۔ مضامین کے اس مجموعے کی اشاعت پر میں انھیں مبارک باد پیش کرتا ہوں''۔

'کاروانِ اردو' کے ادبی مضامین میں 'امیر خسرو کا اجتہاد، اردو کی قدیم داستانیں، اردو ادب اور عصری آگہی، اردو شاعری میں حب الوطنی کے اثرات نیز انشائیہ نگاری خصوصی توجہ کے طلب گار ہیں۔ اگرچہ راقم الحروف کی رائے میں یہ تمام مضامین معلوماتی ہیں، تحقیقی نہیں۔

انگریزی میں منچندہ صاحب کی تین کتابیں ہیں۔ ان کے بیشتر مشمولات اردو کی کتابوں سے مترجم ہیں۔ نام اس طرح ہیں: Precious Memories جس کا پیش لفظ مشہور ادیب، فلسفی، ماہرِ تعلیم اور سیاسی مفکر ڈاکٹر کرن سنگھ نے لکھا ہے۔ Reality Delights جو واقعاتی زندگی کی سچی تصویر پیش کرتی ہے، کا اجرا سابق صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام نے کیا تھا اور پیش لفظ دہلی کی وزیرِ اعلا محترمہ شیلا دکشت نے لکھا تھا۔

تینوں کتابوں میں سے سب سے زیادہ اہم Glimpses of Modern یعنی 'جدید اردو ادب کی جھلکیاں' ہے۔ اس کا پیش لفظ بھی ڈاکٹر کرن سنگھ نے لکھا ہے۔ غیر اردو داں قارئین کے لیے یہ بہت اہم چیز ہے۔ اس میں مصنف نے زیادہ تر 'کاروانِ اردو' کے ادبی مضامین کا انگریزی میں ترجمہ پیش کیا ہے۔ اضافی مضامین میں 'غزل کا وسیع تر ہوتا ہوا دائرہ' اور 'غزل کی کلاسکی تکمیل' شامل ہیں۔ کتاب کی خصوصی دلکشی اُن اشعار پر منحصر ہے جو ادبی حلقوں میں بار بار دُہرائے جاتے ہیں، مثلاً:

کیا حسن نے سمجھا ہے کیا عشق نے جانا ہے
ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے
ساقیا تیری نظر کی لاج رکھنے کے لیے
ہوش میں ہوتے ہوئے بے ہوش ہوجانا پڑ گیا

(نریش کمار شاؔد)

خون اپنا ہو یا پرایا ہو
نسلِ آدم کا خون ہے آخر
جنگ مشرق میں ہو یا کہ مغرب میں
امنِ عالم کا خون ہے آخر

(ساؔحر لدھیانوی)

منچندہ صاحب ایک ممتاز ثلاثۂ احباب کے رکن تھے۔ اس کے باقی دو ادبی صحافی ہفت روزہ 'ریاست' کے مدیر جناب دیوان سنگھ مفتون اور روزنامہ 'پربھات' کے مدیر جناب نانک چند ناز تھے۔ ان تینوں کے بارے میں یہ شعر مشہور تھا:

نہ اپنوں سے گلہ ان کو نہ غیروں سے شکایت ہے
نہ ان سے دوست نالاں ہیں نہ دشمن ہیں خفا ان سے

جس بات پر منچندہ صاحب کو بہت فخر تھا وہ تھی ان کی گاندھی جی سے ایک مختصر ملاقات۔ اپنے ایک مضمون میں انھوں نے لکھا ہے کہ گاندھی جی تو اس دنیا میں نہیں رہے لیکن ان کے خیالات انھیں تا قیامت زندہ رکھیں گے۔ مضمون کے اختتام پر ڈاکٹر سر محمد اقباؔل کا یہ شعر دہرانے کے قابل ہے:

جو بادہ کش تھے پرانے سب اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقاے دوام لا ساقی

(بہ شکریہ 'آگ' لکھنؤ)

منچندہ صاحب نے اپنی ادبی صحافت کا آغاز اردو کی ان کہانیوں اور مضامین سے کیا جن کی اشاعت 'سشما'، 'بانو'، 'کھلونا' اور 'سفینہ' جیسے مقبولِ عام رسائل میں ہوتی تھی۔ بعد میں ان کی تحریریں نہایت معیاری جریدوں مثلاً 'آجکل'، 'ادبِ لطیف'، 'ندیم' اور 'افکار' کے صفحات کی زینت بنیں۔ انگریزی میں ان کے مختلف مضامین 'انڈین ایکسپریس'، 'ہندستان ٹائمز'، 'ٹائمز آف انڈیا'، پائنیر' اور 'آنند بازار پتریکا' وغیرہ میں پانچ دہائیوں تک چھپتے رہے۔ منچندہ صاحب کچھ عرصے تک Armed Forces Civilian Officer کے عہدے پر فائز رہے لیکن ان کا اصلی میدان ادبی صحافت تھا جس سے وہ کسی بھی حالت میں الگ ہونے کے لیے آمادہ نہیں تھے۔

اردو دُنیا

شاریہ شروانی نے اردو میں 100 فیصد نمبر حاصل کیے

نئی دہلی (13 مئی)۔ اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ = سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے، جیسے ہی سی بی ایس ای کی دسویں جماعت کے نتائج کا اعلان ہوا، زینت محل اردو میڈیم اسکول جعفرآباد کی طالبہ شاریہ فاطمہ شروانی کا نام تمام اردو محبین کی زبانوں پر گردش کرنے لگا کیوں کہ اس نے اردو مضمون میں 100 میں سے 100 نمبرات حاصل کرکے نہ صرف اسکول کا نام روشن کیا بلکہ اردو جاننے والوں کا بھی سرفخر سے بلند کردیا۔ انگریزی میں 84، سائنس میں 75، اور سوشل سائنس میں 83 نمبرات حاصل کیے۔ چوہان بانگر، جعفرآباد میں مقیم معروف صحافی صادق خاں شروانی کی بیٹی شاریہ فاطمہ شروانی نے اردو سے لگن اور جذبے کی مثال پیش کرکے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیا ہے۔ جیں ہاں، شاریہ شروانی نے سی بی ایس ای کے دسویں جماعت کے نتائج میں اردو زبان میں صد فیصد کامیابی حاصل کرکے اپنے والدین اور اسکول کا جہاں نام روشن کیا وہیں اردو زبان سے محبت اور لگاؤ کو بھی ظاہر کردیا ہے۔ شاریہ فاطمہ نے بتایا کہ ہم میڈیکل لائن میں جانا چاہتے ہیں مگر اردو زبان وادب کو چھوڑ کر نہیں کیوں کہ ہم نے جب سے آنکھیں کھولیں تہذیب وادب کا محور بنا ہوا ہے کیوں کہ اردو کا دوسرا نام تہذیب ہے، ان شاءاللہ آئندہ بھی اردو میں بہتر سے بہتر کرنے کی کوشش کریں گے۔ (ہمارا سماج۔دہلی)

مدارس کے 178 طلبہ کی
ایس ایس سی امتحان میں شاندار کامیابی

ممبئی (13 مئی)۔ شہر اور مضافات کے دس سے زائد دینی اداروں کے طلبہ نے ایس ایس سی امتحان میں شاندار کامیابی حاصل کی ہے۔ کامیابی حاصل کرنے والے ان طلبہ میں حفاظ اور عالمیت کا کورس کرنے کے علاوہ ایسے طلبہ بھی شامل ہیں جو قرآنِ کریم کے 20 یا 25 پارے مکمل کرچکے ہیں۔ اداروں کے مہتمم نے طلبہ کی کامیابی پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ دینی علوم حاصل کرنے والے طلبہ وطالبات کے لیے ایسی ترتیب بنائی گئی ہے جس سے دونوں علوم کے حصول میں توازن برقرار رکھے۔ اس حوالے سے ذیل میں عروس البلاد کے دینی اداروں کا اختصار سے تذکرہ کیا جارہا ہے۔

کس ادارے میں کتنے طلبہ کامیاب ہوئے:

جامعہ عربی معراج العلوم چیتا کیمپ میں اس سال 75 طلبہ نے ایس ایس سی میں کامیابی حاصل کی۔ شہر اور مضافات کے دینی اداروں میں ایس ایس سی میں کامیاب ہونے والے طلبہ کی یہ سب سے بڑی تعداد ہے۔ مولانا محمد زاہد قاسمی (چیتا کیمپ) کے مطابق ’کامیاب ہونے والوں میں حفاظ 33، عربی درجات میں زیرِ تعلیم طلبہ 18 اور 15 تا 20 پارے حفظ کرنے والے 24 طلبہ ہیں۔ یہ تیسرا بیچ تھا۔ یہ طلبہ آئیڈیل ہائی اسکول اور آزاد ہائی اسکول میں بھی جاتے تھے۔‘

دارالعلوم محبوب سبحانی (کُرلا) میں زیرِ تعلیم حفاظ اور عالمیت کررہے ایس ایس سی میں کامیابی حاصل کرنے والے 28 طلبہ ہیں۔ ان طلبہ نے ورکرس ایجوکیشنل سروس لیگ کے زیرِ اہتمام کُرلا اور ناگپاڑہ میں چلائی جانے والی نائٹ اسکولوں سے استفادہ کیا۔ دارالعلوم امدادیہ چونا بھٹی کے ٹرسٹی مولانا محمود خان دریابادی کے مطابق ادارۂ ہذا میں زیرِ تعلیم 6 طلبہ نے کامیابی حاصل کی۔ ان طلبہ نے بھی مذکورہ ناگپاڑہ نائٹ اسکول میں پڑھائی کی۔ اسی طرح کی مذکورہ نائٹ اسکول میں پڑھنے والے دارالعلوم محمدیہ کے 3 طلبہ نے نمایاں نمبرات حاصل کیے۔ جامعہ رحمانیہ وتحفیظ القرآن (مدرسہ خدیجۃ الکبریٰ) کے سربراہ مولانا الطاف رحمانی نے بتایا کہ 17 طلبہ اور 6 طالبات نے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ مدرسہ اشرف العلوم (نالاسوپارہ) کے نگراں سابق ڈپٹی میئر صغیر ڈانگے کے مطابق شعبۂ حفظ کے 8 اور عالمیت کررہے 14 طلبہ نے ایس ایس سی میں کامیابی حاصل کی ہے۔ یہ طلبہ ادارے کی ہی عمارت میں واقع ضلع پریشد ہائی اسکول میں عصری علوم بھی حاصل کرتے ہیں۔ ادارے میں زیرِ تعلیم طلبہ کا یہ چوتھا بیچ تھا۔ جامعۃ الابرار (وسئی) کے مہتمم مولانا شمیم اختر ندوی کے مطابق ادارے کے 8 طلبہ نے ایس ایس سی میں کامیابی حاصل کی۔ اس ادارے میں زیرِ تعلیم ایس ایس سی امتحان دینے والے طلبہ کا یہ تیسرا بیچ تھا۔

مذکورہ اداروں کی طرح کچھ اور اداروں میں بھی حافظ اور عالم بننے والے طلبہ نے ایس ایس سی امتحان دیا ہے۔ دینی اداروں کے ذمے داران نے آئندہ سال مزید بہتر نتائج کے عزم کا اظہار کیا۔
(انقلاب۔ممبئی)

اردو اخبارات خریدنے پر آمادہ کرنے پر غور کیا جائے
اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کی ماہانہ میٹنگ میں فیصلہ کیا گیا کہ اپنے گھروں اور دکانوں پر ادو میں تختی اور بورڈ لگوائیں

مظفرنگر (14 مئی)۔ ڈاکٹر شمیم الحسن کے زیرِ صدارت اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن مظفرنگر کی ماہانہ میٹنگ بدرالزماں خاں کی رہائش گاہ پر منعقد ہوئی۔ اس میٹنگ کی نظامت سکریٹری شمیم قصار نے کی، جب کہ میٹنگ میں گذشتہ ماہ میں پاس کیے گئے ایجنڈوں پر تبصرہ اور اردو کے فروغ کے لیے کی جانے والی کوششوں پر تبادلۂ خیال ہوا۔ اس موقعے پر اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے ضلع صدر کلیم تیاگی نے کہا کہ ہمارا مقصد اردو زبان کو زیادہ سے زیادہ فروغ دینا ہے کیوں کہ ہم سبھی اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ اردو ادب وتہذیب کی زبان تو ہے ہی ساتھ ہی ہمارا مذہبی اثاثہ عربی زبان کے بعد سب سے زیادہ اردو زبان میں موجود ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر ہم یا ہماری نسلیں اردو زبان سے ناآشنا ہیں تو زبان کے ساتھ ساتھ ہم دین سے بھی دور ہوجائیں گے، بلکہ اگر ہم یہ کہیں کہ ہم اب بھی اسی وجہ سے دین سے دور ہوچکے ہیں تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں، اس لیے اردو کو اپنانا، اس کی حفاظت کرنا ہماری ذمے داری اور ہم سب کے لیے اہم فریضہ ہے۔ حاجی شکیل احمد نے کہا کہ ہم سب اپنے گھروں اور دکانوں پر ادو زبان میں نام کی تختی اور بورڈ ضرور لگوائیں تاکہ دوسرے لوگ بھی اس سے سبق حاصل کریں اور اردو کا ماحول بنے۔ حاجی سلامت راہی نے کہا کہ اسی ہفتے بازار میں دکانداروں سے مل کر اردو میں بھی بورڈ لگوانے کی مہم چلائی جائے گی۔ ڈاکٹر شمیم الحسن نے ہر گھر اردو اخبار کی تجویز پیش کی، جس کی سبھی موجود ممبران نے تعریف کی اور لوگوں کو اردو اخبارات خریدنے پر آمادہ کرنے پر غور کرنے کا عزم کیا۔

ضلع نائب صدر ڈاکٹر سلیم سلمانی نے سوشل میڈیا پر اپنے پیغامات اردو زبان میں لکھنے پر زور دیا اور کہا کہ ہمارے لوگ ہی اس پر عمل نہیں کر پارہے ہیں تو ہم دوسروں کو کیا تلقین کرسکتے ہیں۔ ڈاکٹر فرخ حسن اور ندیم ملک نے مئی کے آخر یا جون کے پہلے ہفتے میں ایک شعری نشست منعقد کرانے کی تجویز رکھی جس پر سبھی نے اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ نائب خازن شہزاد تیاگی نے کہا کہ اردو پیار ومحبت کی زبان ہے جسے ہر کوئی پسند کرتا ہے، اس لیے اردو کو اپنائیں اور اپنے معاشرے کو تہذیب یافتہ بنائیں۔ میٹنگ میں ڈاکٹر شمیم الحسن، حاجی سلامت راہی، کلیم تیاگی، بدرالزماں خاں، شمیم قصار، ڈاکٹر سلیم سلمانی، شہزاد تیاگی، ڈاکٹر فرخ حسن، ندیم ملک، ماسٹر امتیاز علی، محمد ساجد خاں، محمد اعظم خاں اور چاند میاں وغیرہ موجود تھے۔ (انقلاب۔دہلی)

جامعۃ الہدیٰ ہائی اسکول مالیگاؤں کا
دسویں جماعت کے نتائج شاندار رہے

مالیگاؤں (13 مئی)۔ ہر سال کی طرح اس سال بھی جامعۃ الہدیٰ ہائی اسکول مالیگاؤں کا دسویں جماعت کا نتیجہ 98.48 فیصد رہا جس میں 66 طلبہ نے شرکت کی۔ تمام طلبہ میں محمد مصطفیٰ افسر علی نے 86.20 فیصد حاصل کرکے اسکول میں اول، جب کہ محمد طیب عبدالحمید (85.60 فیصد)، سیّد ساجد شریف الدین (84 فیصد)، سلطان عمر رئیس احمد (83.60 فیصد) اور شیخ سلمان شیخ اشفاق (82.20 فیصد) نے حاصل کرکے بالترتیب دوم، سوم، چہارم اور پنجم مقامات حاصل کیے۔ ان طلبہ نے نہ صرف اپنا بلکہ اپنے اساتذہ اور والدین کا بھی نام روشن کیا۔ 16 طلبہ نے امتیازی نمبرات حاصل کیے جب کہ 43 طلبہ فرسٹ کلاس رہے۔ اس کامیابی پر انتظامیہ، ہیڈ ماسٹر اور اسٹاف جامعۃ الہدیٰ ہائی اسکول کی جانب سے تمام ہی کامیاب طلبہ کو مبارک باد پیش کی اور دعا دیتے ہوئے کہا کہ اللہ انھیں آئندہ بھی اسی طرح کامیابی وسربلندی عطا فرمائے۔

(انقلاب۔ممبئی)

انجمن نورالاسلام اردو ہائی اسکول
ساکی ناکہ کی شاندار کامیابی

ساکی ناکہ، ممبئی (13 مئی)۔ ایس ایس سی بورڈ امتحان میں اس سال انجمن نورالاسلام اردو ہائی اسکول ساکی ناکہ نے شاندار کامیابی کا مظاہرہ کرتے ہوئے 100 فیصد حاصل کیے۔ 4 بچوں نے 90 فیصد سے زیادہ اور 22 بچوں نے 80 فیصد سے زیادہ نمبرات حاصل کیے۔

خان منتشا جمال اختر نے 95.20 فیصد اور شیخ محمد شاہد آصف علی نے 94.80 فیصد حاصل کرکے اسکول کا نام روشن کیا۔ اسکول کے تمام ٹرسٹیاں، اساتذہ اور ہیڈ ماسٹر نے تمام کامیاب طلبہ کو دلی مبارک باد اور روشن مستقبل کے لیے دعائیں دی ہیں۔ (انقلاب۔ممبئی)

ایس ایس سی بورڈ کے امتحان میں
سوئیس اردو ہائی اسکول کا شاندار نتیجہ

دھولیہ (13 مئی)۔ ادارہ سوئیس کے زیرِ انصرام جاری سوئیس اردو ہائی اسکول کا ایس ایس سی کا نتیجہ 80.55 فیصد رہا۔ انصاری ارم عبداللطیف 84.80 فیصد، جویریہ ضمیر شیخ 83.40 فیصد، منیار عائشہ صدیقہ نے 82.40 فیصد نمبرات حاصل کرکے ہائی اسکول سطح پر اول، دوم اور سوم مقام حاصل کیا ہے۔ اس سال سوئیس اردو ہائی اسکول سے ایس ایس سی بورڈ کے امتحان میں 144 طلبہ شریک ہوئے تھے۔ 5 طلبہ نے امتیازی نمبرات سے کامیابی حاصل کی۔ درجۂ اوّل میں 22، درجۂ دوم میں 72 اور درجۂ سوم میں 17، اس طرح 116 طلبہ نے کامیابی حاصل کی ہے۔ ایس ایس سی کے شاندار نتیجے پر ادارۂ ہذا کے چیئرمین الحاج اخلاق احمد، سکریٹری الحاج محمد عفان انصاری، جوائنٹ سکریٹری الحاج زاہد حسین اور ادارے کے دیگر منتظمین نے ہائی اسکول کی صدر معلّمہ چاہت پروین، ہائی اسکول کے اساتذہ اور کامیابی حاصل کرنے والے طلبہ کو مبارک باد پیش کی ہے۔ (انقلاب۔ممبئی)

سرکاری امداد یافتہ اردو میڈیم اسکولوں کی کارکردگی ناقص

دسویں وبارہویں جماعت کے نتائج نے تعلیمی نظام کی قلعی کھول دی، منتظمہ کمیٹیوں کو فوری اقدام کی ضرورت

نئی دہلی (14 مئی)۔سنٹرل بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کے دسویں اور بارہویں جماعت کے سالانہ نتائج گذشتہ روز جاری کیے گئے تھے۔ پرانی دہلی کے سرکاری امداد یافتہ اردو میڈیم اسکولوں نے ناقص کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔عموماً اسکولوں کی کوشش ہوتی ہے کہ بورڈ امتحانات کے نتائج شاندار آئیں تا کہ ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ ان کی پیٹھ تھپتھپائے لیکن گذشتہ روز جو نتائج سامنے آئے ہیں وہ نہایت تشویشناک ہیں۔ یہ حالات منتظمہ کمیٹیوں کو سر جوڑ کر بیٹھنے اور نتائج پر غور وفکر کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔فراش خانے میں واقع مظہرالاسلام سیکنڈری اسکول کا دسویں جماعت کا نتیجہ 33.33 فیصد آیا ہے۔محض پانچ طلبہ نے ہی بورڈ امتحان میں کامیابی حاصل کی ہے۔چاندنی چوک میں واقع فتح پوری مسلم سینئر سیکنڈری اسکول کے بارہویں اور دسویں جماعت کا نتیجہ 60 فیصد درج ہوا ہے۔اسکول کے پرنسپل نے اسے پہلے سے بہتر قرار دیا ہے۔انھوں نے کہا کہ میں الیکشن ڈیوٹی پر چلا گیا تھا، اس لیے نتیجہ توقع سے بہتر نہیں آپایا۔ دریا گنج میں واقع حکیم اجمل خاں اسکول کے بارہویں کلاس کا نتیجہ 62 فیصد رہا جب کہ اجمیری گیٹ پر واقع اینگلو عربک سینئر سیکنڈری اسکول کے بارہویں جماعت کے بورڈ کے امتحانات میں کل شریک طلبہ کی تعداد 266 تھی اور نتائج کا فیصد 83.45 رہا۔دسویں جماعت کے بورڈ امتحان میں کل 162 طلبہ شریک ہوئے تھے اور ان کا نتیجہ 87.65 فیصد رہا۔ باڑہ ہندوراؤ میں واقع شفیق میموریل سینئر سیکنڈری اسکول کے دسویں جماعت کا نتیجہ 85.41 فیصد درج ہوا۔48 طلبہ نے بورڈ امتحان دیا تھا جس میں 41 طلبہ نے کامیابی حاصل کی ہے۔ 7 طلبہ کی کمپارٹمنٹ آئی ہے۔ اسکول نے بارہویں جماعت کا نتیجہ مضمون کے مطابق جاری کیا ہے۔مجموعی نتائج پوچھنے کے لیے اسکول کے پرنسپل کو کال کیا گیا،لیکن انھوں نے یہ کہہ کر بات کرنے سے منع کر دیا کہ وہ ابھی میٹنگ میں ہیں۔ بتادیں کہ مذکورہ پانچویں اسکول سرکاری امداد یافتہ ہیں جن کو مینجمنٹ کمیٹیوں کے ذریعے چلایا جاتا ہے۔ پرانی دہلی کی تاریخی تعلیمی درس گاہوں میں ان اسکولوں کا شمار ہوتا ہے۔حال میں یہ ادارے اپنے سنہرے ماضی کے ساتھ انصاف نہیں کر پا رہے ہیں، مستقبل میں ان سے اچھی کارکردگی کی امید کی جاسکتی ہے۔

دوسری طرف پرانی دہلی کے سرکاری اسکولوں کا نتیجہ سرکاری امداد یافتہ اسکولوں کے مقابلے قدرے تسلی بخش رہا ہے۔ لال کنواں پر واقع ایس کے وی زینت محل اسکول کے بارہویں جماعت کا نتیجہ صد فیصد درج ہوا جب کہ دسویں جماعت کا نتیجہ 90.66 فیصد رہا۔ بارہویں جماعت کی طالبہ انیقہ بنت فضل الرحمٰن نے اردو کے پرچے میں صد فیصد نمبر حاصل کر کے اسکول اور والدین کا نام روشن کیا۔ بارہویں جماعت کی طالبہ مسکان بنت انیس احمد نے 500 میں سے 448 نمبر حاصل کر کے اسکول میں اول مقام حاصل کیا۔اقرا آمنہ بنت عبدالصمد نے 500 میں سے 440 نمبر حاصل کر کے دوسرا مقام حاصل کیا۔ رمشا بنت محمد اشتیاق نے 500 میں سے 433 نمبر حاصل کر کے تیسرا مقام حاصل کیا۔

ایس کے وی نمبر 2 اردو میڈیم جامع مسجد اسکول کا دسویں اور بارہویں جماعت کا نتیجہ صد فیصد آیا۔ ایس بی وی نمبر 1 جامع مسجد اردو میڈیم اسکول کے بارہویں جماعت کا نتیجہ 86 فیصد آیا۔ پچھلے سال کے مقابلے میں نتیجہ ڈاؤن ہوا ہے۔ وہیں دسویں جماعت کا نتیجہ 99 فیصد آیا ہے۔ (انقلاب۔ دہلی)

مسلم تاریخ وتہذیب کے فروغ کے لیے اردو زبان کا تحفظ ضروری: پروفیسر حکیم سیّد ظل الرحمٰن

ابن سینا اکیڈمی اور اردو کی خدمات قابلِ تقلید: ڈاکٹر مہتاب عالم

علی گڑھ (14 اپریل)۔ابنِ سینا اکیڈمی علی گڑھ کے زیرِ اہتمام شاندار محفلِ مشاعرہ کا انعقاد 'محفلِ محبت' کے عنوان سے ابنِ سینا اکیڈمی کے خوب صورت ہال میں کیا گیا۔کُل ہند مشاعرے کی صدارت پدم شری پروفیسر حکیم سیّد ظل الرحمٰن نے کی جب کہ مہمانِ خصوصی ندیم صدیقی نے شرکت کی۔ مہمانِ اعزازی کے طور پر ڈاکٹر مہتاب عالم نے محفل کو وقار بخشا اور رونقِ محفل کی حیثیت سے ڈاکٹر انجم بارہ بنکوی اور ناصر برنی (سعودی) نے عزت بخشی۔ نظامت کے فرائض علی گڑھ کے معروف شاعر اور کونسلر مشرف حسین محضر نے بہ حسن وخوبی انجام دیے۔ مشرف حسین محضر کے غزلیہ مجموعے 'ذرا آہستہ چل' کا اجرا پدم شری پروفیسر حکیم سیّد ظل الرحمٰن او دیگر مہمانان کے دستِ مبارک سے عمل میں آیا۔حکیم سیّد ظل الرحمٰن نے کہا کہ مشرف حسین محضر ایک کامیاب سیاست داں ہونے کے ساتھ پختہ گو شاعر ہیں، ان کے دم سے علی گڑھ کی ادبی فضاؤں میں رنگ بھرتا رہتا ہے۔ انھوں نے مسلم تاریخ کے اردو سے گہرے رشتے پر روشنی ڈالتے ہوئے اردو زبان کے تحفظ پر زور دیا۔ ڈاکٹر مہتاب عالم نے اپنے خطاب میں کہا کہ اہلِ علم اور اہلِ ہنر ہمیشہ اپنی زبان وتہذیب کے لیے فکرمند رہتے ہیں۔ پدم شری حکیم سیّد ظل الرحمٰن کا تعلق بھوپال سے ہے اور انھوں نے اپنی کوشش سے ابنِ سینا اکیڈمی میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ قابلِ تقلید ہیں۔ یہاں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے پروفیسروں کی ایک بڑی تعداد ہے اور اس موقعے پر مجھے یہ کہتے ہوئے فخر ہو رہا ہے کہ نوابینِ بھوپال کے ذکر کے بغیر یونی ورسٹی کی تاریخ نامکمل ہے۔ ندیم ماہر صاحب کے ذریعے ابنِ سینا اکیڈمی میں سجائی گئی محفلِ محبت، عالمی مشاعرے کا انعقاد اور اس موقعے پر مشرف حسین محضر کے شعری مجموعے کا اجرا قابلِ تحسین ہے۔ مشرف حسین محضر کی شاعری کی خوبی یہ ہے کہ وہ صرف لب ورخسار کی باتیں نہیں کرتے بلکہ ان کی شاعری میں زندگی کے مسائل فنی خوبی سے جس طرح بیان کیے گئے ہیں وہ اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ سیاست داں ہیں اور حالاتِ حاضرہ پر ان کی گہری نظر ہے۔ ان کی شاعری ایسا دستاویز ہے جس میں ہندستان میں اقلیتوں کے مسائل اور حکومت کا جبر نمایاں ہے۔ان کی فکر کی تازگی قاری کو متوجہ کرتی ہے۔ میں اس مجموعے کے لیے انھیں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ سبھی مہمانان اور شعرائے کرام نے مشرف محضر کو مبارک باد پیش کی۔ اس سے قبل مشرف حسین محضر نے جملہ مہمانان اور شعرائے کرام کو ردائے ادب، کتاب اور بیگ پیش کر کے استقبال کیا۔کُل ہند مشاعرے میں جن شعرائے کرام نے اپنے بہترین کلام سے سامعین کو محظوظ کیا اُن میں نمایاں طور پر ندیم ماہر (قطر)، ڈاکٹر مہتاب عالم، شارق عدیل، ڈاکٹر انجم بارہ بنکوی، ندیم صدیقی، ناصر برنی (سعودی)، عبداللہ راہی، ریاض احمد منصوری، عبدالرحمٰن سیف عثمانی، پروفیسر سیّد سراج اجملی، نسیم نوری، اویس جمال شمسی، ڈاکٹر مجیب شہزر، پروفیسر وصی بیگ بلال اور مشرف حسین محضر کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

'محفلِ محبت' میں خالد انصاری، پروفیسر ضیاء الدین، شفیق خاں، مجاہد رضا، ٹھاکر شفیق چودھری، ڈاکٹر آفتاب عالم، اختر بھائی، فہیم خالد، فاروق سیّد (مدیر گُل بوٹے، ممبئی)، ڈاکٹر کمال مانڈلیکر، حاجی نورالدین نوری، محمد شعیب اور پرویز احمد کی شرکت باعثِ مسرت رہی۔ آخر میں داعیِ مشاعرہ ندیم ماہر صاحب نے سبھی مہمانوں اور شعرا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ابنِ سینا اکیڈمی کے لیے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے تعاون پیش کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ ندیم ماہر نے کُل ہند مشاعرے کے انعقاد میں حکیم سیّد ظل الرحمٰن صاحب کی سرپرستی اور ان کے ذریعے ابنِ سینا اکیڈمی کے قیام کو ملت کے بڑے سرمایے سے تعبیر کرتے ہوئے محفلِ محبت کو آئندہ تک ملتوی کرنے کا اعلان کیا۔

(اردو ایکشن۔ بھوپال)

جامعہ ملّیہ اسلامیہ میں شعبۂ اردو کے زیرِ اہتمام توسیعی خطبہ

نئی دہلی (6 مئی)۔شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیرِ اہتمام دیارِ میؔر کے میر انیس ہال میں 'فراق گورکھپوری کی شخصیت اور فن' ایک جائزہ' کے عنوان سے توسیعی خطبے کا انعقاد کیا گیا۔ یہ خطبہ کناڈا میں مقیم ممتاز اردو محقق اور نقاد ڈاکٹر سیّد تقی عابدی نے پیش کیا۔ ڈاکٹر سیّد تقی عابدی نے فراقؔ گورکھپوری کے سوانحی کوائف، شخصیت، ذہنی کشمکش اور نفسیاتی پیچیدگیوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کی شاعری کے چند اچھوتے اور نئے ابعاد و جہات کو روشن کیا۔ انھوں نے کہا کہ فراقؔ نے ہندستان کی مٹی سے استعارے کی فصل اُگائی۔ فراقؔ کی شاعری صحیح معنوں میں سنسکرت اور ہندی کی جمالیات کا اعلاترین اردو روپ ہے۔ فراقؔ نے طرزِ ادا، فکر وخیال اور استعارات وعلامات کی سطح پر اردو شاعری کو اجنبی اور نادر جہتوں سے آشنا کیا۔ صدارتی خطبے میں صدر شعبۂ اردو پروفیسر کوثر مظہری نے کہا کہ فراقؔ گورکھپوری ہمارے شعبے میں بطورِ خاص مطالعۂ نصاب میں شامل ہے۔ فراقؔ کی شاعری مسرت سے بصیرت تک کا سفر طے کرتی ہے۔ اپنی ہندستانی جڑوں اور طرزِ تخلیق کے سبب فراقؔ تلسی داس اور رسکھان سے متاثر تھے۔ خطبے کے کنوینز ڈاکٹر سیّد تنویر حسین نے مہمان خطیب کا استقبال کرتے ہوئے ان کا مفصل تعارف پیش کیا۔ خطبے کا آغاز ڈاکٹر شاہ نواز فیاض کی تلاوت اور اختتام ڈاکٹر م شیر احمد کے اظہارِ تشکر پر ہوا۔ پروگرام میں ایڈوکیٹ خلیل الرحمٰن، پروفیسر عبدالقیوم انصاری، پروفیسر شہزاد انجم، پروفیسر احمد محفوظ، پروفیسر ندیم احمد، پروفیسر عمران احمد عندلیب، پروفیسر سرور الہدیٰ، ڈاکٹر شاہ عالم، ڈاکٹر خالد مبشر، ڈاکٹر محمد مقیم، ڈاکٹر جاوید حسن، ڈاکٹر شاداب تبسم، ڈاکٹر راہین شمع، ڈاکٹر ثاقب عمران، ڈاکٹر نوشاد منظر، ڈاکٹر غزالہ فاطمہ، ڈاکٹر محمد آدم، ڈاکٹر حنبل رضا اور محمد عارف کے علاوہ کثیر تعداد میں ریسرچ اسکالر اور طلبہ وطالبات موجود تھے۔ (انقلاب۔ دہلی)

رؤف صادق کی کتاب 'ہم اپنے تماشائی' کا اجرا

ممبئی (22 اپریل)۔ شیخ نیّر حسن کی اطلاع کے بہ موجب معروف اردو شاعر ادیب مصور اور افسانچہ نگار جناب رؤف صادق کی کتاب ہم اپنے تماشائی (افسانچے) کی رسمِ اجرا 20 اپریل 2025 آٹھ بجے شب بزم شمس رمزی کے زیرِ اہتمام ملت اردو ہائی اسکول مالونی ملاڈ، ممبئی میں جناب اطہر اعظمی کی صدارت میں اور ممتاز فکشن رائٹر ڈاکٹر سلیم خان کے ہاتھوں انجام پائی۔ رسمِ اجرا انجام دینے کے بعد ڈاکٹر سلیم خان نے کہا رؤف صادق نے شاعری کے بعد فکشن میں اپنی اختصار نویسی کا پرچم بلند کیا ہے جس میں وہ کامیاب ہیں۔ انھوں نے کہا کہ رؤف صادق کو اپنے قاری کی ذہانت پر اعتماد ہے اس لیے وہ ہر بات کو کھول کر بیان کرنے کے بجائے اپنے افسانچے کو ایسے موڑ پر ختم کر دیتے ہیں جہاں سے آگے قاری اس کو اختتام تک پہنچاتا ہے۔ جناب اطہر اعظمی نے اپنی صدارتی تقریر میں رؤف صادق کے فکر وفن کو عہدِ حاضر سے ہم آہنگ قرار دیتے ہوئے کہا ان کے افسانچوں میں دردمندی، فکری پختگی اور زوال پذیر معاشرے کی ...(بقیہ صفحہ 7 پر)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : دفتر کھلا (کالموں کا مجموعہ)
مصنف : ڈاکٹر یونس حسنی
ضخامت : 320 صفحات
قیمت : 1200 روپے
ملنے کا پتا : رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی
تبصرہ نگار : پروفیسر شاہد کمال

E-mail: shhdkamal@yahoo.com
Mob. 923003739850

زیرِ نظر کتاب ڈاکٹر یونس حسنی صاحب کے کالموں کا مجموعہ ہے جو 1998 سے 2023 تک روزنامہ 'ایکسپریس' کراچی میں شائع ہوئے۔ شاعروں، ادیبوں میں کالم نویسی کی تو بہت سی مثالیں ہماری صحافت میں پائی جاتی ہیں لیکن محققین کے تعلق سے بہت کم دیکھنے میں آیا ہے کہ انھوں نے صحافت کے اس شعبے میں خامہ فرسائی کی ہو۔ عہدِ جدید میں مشفق خواجہ کے علاوہ ڈاکٹر یونس حسنی وہ دوسرے شخص ہیں جنھوں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے اخباری کالم کو منتخب کیا اور تواتر سے مختلف موضوعات پر گفتگو کی۔ آدمی چوں کہ زبان دان ہیں اس لیے ہر موضوع پر سیر حاصل گفتگو نہایت جامعیت سے کرتے ہیں۔ ان کے کالموں کی خاص بات یہ ہے کہ ان میں سیاسی عناصر دال میں تڑکے کے طور پر زیرِ بحث آتے ہیں یا یہ یوں کہیں کہ کھانے میں نمک کا کردار ادا کرتے ہیں کہ صحافت میں سیاست نہ ہو تو معاملہ پھیکا رہتا ہے۔ یونس حسنی کی ان تحریروں کی خاص بات وہ ہمہ جہتی ہے جس نے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اپنے اندر سمیٹ رکھا ہے۔ سیاست، تبلیغ، کھیل، تعلیم، اخلاق، نفسیات اور نہ جانے کیا کیا آپ نے اپنے کالموں میں ایک دوسرے سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ بعض جگہوں پر تو ایک سے زائد نکات اس خوبی اور جامعیت سے جلوہ آرائی کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ گویا بات سے بات نکلتی چلی جاتی ہے اور قاری مصنف کی گرفت سے نکلنے نہیں پاتا۔ جس موضوع کو جس طرح چاہیں بیان کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ انٹرنیشنل افیئرز پر گفتگو کرتے ہوئے بھی اس روانی اور اختصار کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا اور ان تمام معاملات کو اُمت مسلمہ کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیت کے غلاف میں لپیٹ کر سیاسی اور سماجی معاملات کی عمدہ منظر کشی کرتے ہیں، اس سلسلے میں 'خاموشی کے گناہ گار'، 'مغرب کے امتیازات'، اور 'کچھ سوال اٹھتے ہیں' میں یونس حسنی نے جس خوب صورت اور جامع انداز سے مغرب کے منافقانہ رویوں کے اثرات کی وضاحت کی ہے وہ قابلِ داد ہے۔ آپ کے کالم اپنے اندر ایک ایسا جہانِ معنی آباد رکھتے ہیں جو پڑھنے والے کو سرسری گزرنے نہیں دیتا بلکہ اسے زندگی کے مختلف رنگ دکھاتے ہوئے بار بار ٹھہرنے اور غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ آپ کی تحریریں محض صحافیانہ انداز کی حامل نہیں ہوتیں بلکہ فکر سے اصلاح تک کے مراحل پوری گرفت کے ساتھ طے کرتی ہیں۔ آپ کے کالم زندگی نامہ ہیں جن میں تاجر، مولوی، سیاستدان، دوست احباب، کھلاڑی، اداکار اور نجانے کون کون اپنی اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ قاری کو مصنف کی اعلا مشاہداتی حس اور عصرِ حاضر سے باخبری کا احساس بھی ہوتا رہتا ہے۔ یونس حسنی کے کالموں میں کہیں بھی ہلکے پن کا شائبہ نہیں ہوتا، وہ ہر سطر میں اپنے وجود سے پوری طرح جڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ برجستگی اور بے ساختگی ان کا وصف ہے۔ ایک اور خاص بات جو ان کے ہاں دکھائی دیتی ہے وہ یہ کہ ان کے کالم سیاست یا سماج سے جڑے بڑے لوگوں کی مدح سرائی نہیں ہیں۔ وہ اگر یاد کرتے ہیں تو اپنے دفتر کے کلرک حفیظ قریشی کو اور خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں تو مشفق خواجہ کو، ان کے ہاں کہیں بھی اہلِ منصب کی قصیدہ گوئی کا کوئی جملہ نہیں پایا جاتا ہے۔ شاید اسی سبب سے ایک طویل عرصے کی کالم نگاری بھی انھیں پیشہ ور اول درجے کے کالم نگاروں میں جگہ نہ دلوا سکی جو مختلف مفادات کے حصول کے لیے مدح سرائی کی ڈفلی بجاتے ہیں۔ لوگ جب یہ کتاب پڑھیں گے تو ان کی ملاقات ایک ایسے پڑھے لکھے اور باشعور لکھاری سے ہوگی جو معاشرے کی نبض پر ہاتھ رکھے مختلف امراض کا نشان دہی کر رہا ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا یہ کالم نہیں زندگی کی تصویریں ہیں، کچھ دل فزا اور کچھ ہوش ربا۔ انھیں پڑھیے تا کہ زندہ رہنے اور زندگی جینے کا احساس جاگے۔

***

نام کتاب : امتیازات
مصنف : ڈاکٹر احمد امتیاز
ضخامت : 248 صفحات
قیمت : 250 روپے
ملنے کا پتا : ایم آر پبلی کیشنز، دریا گنج، نئی دہلی-110002
تبصرہ نگار : ڈاکٹر اشرف علی

E-mail: ashrafalimehadvi@gmail.com

ڈاکٹر امتیاز احمد دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ایک ممتاز و مایۂ ناز استاد ہیں جنھیں ادبی حلقوں میں احمد امتیاز کے نام سے جانا جاتا ہے۔ وہ نہ صرف درس و تدریس کے میدان میں نمایاں مقام رکھتے ہیں بلکہ اردو تنقید کے افق پر ایک روشن ستارے کی حیثیت سے جلوہ گر ہیں۔ احمد امتیاز کا شمار اُن نوجوان ناقدین میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو تنقید کو ایک نیا زاویہ، نیا اسلوب اور نئی تازگی عطا کی ہے۔ ان کی تحریروں میں روایت کے شعور کی آگہی کے ساتھ ساتھ جدید حسیت اور فکری توانائی کی جھلک نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہے۔ ان کا طرزِ اظہار، زبان و بیان کی روانی اور نکتہ رسی کا قرینہ انھیں ہم عصروں میں منفرد مقام عطا کرتا ہے۔

میری احمد امتیاز سے ادبی شناسائی کا پہلا وسیلہ ان کی وہ مشہور کتاب 'ارمغانِ ادب' بنی جو مجھے اپنے طالبِ علمی کے ایام خصوصاً یو.جی سی نیٹ کی تیاری کے دوران دستیاب ہوئی۔ یہ کتاب اُس وقت میرے لیے ایک رہنما کی حیثیت رکھتی تھی۔ اُس کی مشقیں، سوالات، ادبی نکات اور فکری تشریحات نے میرے فہم و ادراک کو جلا بخشی اور مجھے مسابقتی امتحان میں کامیابی کی راہ دکھائی۔ تعلیمی میدان میں سرگرم طلبہ کے درمیان یہ کتاب بے حد مقبول رہی ہے اور آج بھی اپنی افادیت کے باعث قدردانی کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔

احمد امتیاز کو اردو نثر بالخصوص غیر افسانوی نثر کے ایک سنجیدہ اور معتبر نقاد کی حیثیت حاصل ہے۔ اس حوالے سے ان کی کئی وقیع تصانیف منظرِ عام پر آچکی ہیں جن میں 'انشائیہ کے فنی سروکار'، 'ادبی محکمے' اور 'رشید احمد صدیقی بحیثیت خاکہ نگار' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کتابوں میں احمد امتیاز نے اردو نثر کی فکری، فنی اور اسلوبی جہات پر گہرائی سے روشنی ڈالی ہے۔

غیر افسانوی نثر کی دو اہم اصناف یعنی انشائیہ اور خاکہ پر فکر انگیز مکالمہ قائم کرتے ہوئے احمد امتیاز نے ایک نئی ادبی اصطلاح 'خاکشائیہ' کی تجویز پیش کی ہے جو انشائیے کی طرب انگیزی اور خاکے کی شخصی بصیرت کو یکجا کرتی ہے۔ یہ ترکیب بظاہر سادہ ہے مگر اس کے پیچھے ایک سنجیدہ تنقیدی فکر کارفرما ہے۔ اگرچہ یہ کہنا قبل از وقت ہوگا کہ ادبی حلقے اس اختراع کو کس قدر قبول کرتے ہیں تاہم یہ بات بلاتردد کہی جاسکتی ہے کہ 'خاکشائیہ' احمد امتیاز کا ایک فکری تجربہ ہے جو اردو نثر کی ارتقائی جہتوں میں ایک دل چسپ اضافہ ثابت ہوسکتا ہے۔

وقت کا پہیہ گھومتا رہا اور آج ایک اور کتاب میرے مطالعے کی میز پر جلوہ افروز ہے۔ احمد امتیاز کی تنقیدی تحریروں پر مشتمل کتاب امتیازات۔ یہ مجموعہ 2016 میں ایم آر پبلی کیشنز، دریا گنج، دہلی سے شائع ہوا اور اپنی اشاعت کے وقت سے ہی ادبی دنیا میں پذیرائی حاصل کر چکا ہے۔ کتاب کی فکری وقعت اور تنقیدی معیار کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس پر تقریظ نامور نقاد پروفیسر عتیق اللہ نے رقم کی ہے جو خود اردو ادب کا ایک معتبر نام ہیں۔

زیرِ نظر کتاب 'امتیازات' اردو ادب میں ایک وقیع اضافہ ہے جو قاری کو فکر و فن کی گوناگوں جہات سے روشناس کراتی ہے۔ اس کتاب میں شامل کل 22 مضامین نہ صرف اردو تنقید کے دائرے کو وسعت دیتے ہیں بلکہ مصنف کی علمیت، بصیرت اور تنقیدی زاویۂ نگاہ کی بھرپور نمائندگی بھی کرتے ہیں۔ ان مضامین میں کلاسکی ادب، جدید رجحانات، نسائیت، تعلیمی نظریات، ترجمہ نگاری، ادبی شخصیات اور اسلوبیاتی تجزیے جیسے مختلف موضوعات کو نہایت سلیقے اور فکری گہرائی کے ساتھ برتا گیا ہے۔

'سودا کے قصائد میں طنز کی صورت' سے لے کر 'افسانوی مجموعوں کی دستیابی کا مسئلہ' اور 'اردو میں ادبی ترجمہ کی روایت' تک ہر مضمون اپنے اندر ایک فکری جہان سموئے ہوئے ہے۔ اقبال کی متصوفانہ فکر، مولانا آزاد کے تعلیمی خیالات، خورشید الاسلام کا جہانِ نقد اور عبدالقوی دسنوی اور اقبال جیسے مضامین ادب کے سنجیدہ قاری کو فکر کی نئی راہوں پر گامزن کرتے ہیں جب کہ تاباں کی غزل گوئی، پروین شیر کا شعری سیاق اور خواتین کی شاعری جیسے مباحث عصرِ حاضر کی حساس جہات کو اجاگر کرتے ہیں۔

'امتیازات' کا عنوان خود مصنف کی علمی شناخت اور تنقیدی انفرادیت کی علامت ہے جو ان کے قلمی نام سے اخذ کردہ ہے۔ احمد امتیاز کا اسلوب رواں، شستہ اور تنقیدی وقار سے لبریز ہے۔ ان کی تحریر میں ایک ایسا توازن پایا جاتا ہے جو تحقیق و تجزیہ کو فنی جمالیات سے ہم آہنگ کر دیتا ہے۔ یہ کتاب اردو تنقید کے سنجیدہ قارئین کے لیے ایک قیمتی اثاثہ ہے۔

یہ کہنا بجا ہوگا کہ احمد امتیاز کی تحریریں صرف تنقید نہیں بلکہ وہ قاری کو ادب کی گہرائیوں میں اُترنے، سوال کرنے اور نئی فکری زمینیں تلاش کرنے کی تحریک دیتی ہیں۔ اُن کی تحریر میں جہاں ماضی کی گونج سنائی دیتی ہے وہیں حال کا شعور اور مستقبل کی تمنائیں بھی پنہاں ہیں۔

اسی طرح 'امتیازات' کو مزید معنویت تب حاصل ہوتی ہے جب ہم احمد امتیاز کے تنقیدی رویّے کو اردو تنقید کی مجموعی تاریخ میں رکھ کر دیکھتے ہیں۔ اردو تنقید نے آغاز سے لے کر آج تک مختلف دبستانوں اور رجحانات کا مشاہدہ کیا ہے جن میں سرسیّد کی عقلی تنقید، حالی کی اخلاقی تنقید، شبلی کا جمالیاتی ذوق، حالی و شبلی سے اقبال اور پھر محمد حسن عسکری، آل احمد سرور، شمس الرحمٰن فاروقی اور وارث علوی جیسے جدید نقادوں کی فکر شامل ہے۔ احمد امتیاز نے ان تمام رجحانات کا شعوری مطالعہ کرتے ہوئے اپنی راہ متعین کی ہے۔ ان کی تنقید میں کسی ایک نظریے یا مکتبۂ فکر کی اندھی تقلید نہیں ملتی بلکہ وہ ایک آزاد فکر اور تجزیاتی ذہن کے ساتھ مسائل کا جائزہ لیتے ہیں۔

'امتیازات' کی ایک اور نمایاں خوبی اس کا تنوع ہے۔ ان کے مضامین محض ایک ادبی شخصیت یا صنف کے تجزیے تک محدود نہیں بلکہ وہ سماجی و ثقافتی تناظرات کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔ ان کی تحریر میں علمی وقار کے ساتھ ساتھ ایک فکری لچک بھی پائی جاتی ہے جو انھیں ایک ترقی پسند مگر غیر جذباتی نقاد کے طور پر پیش کرتی ہے۔ ان کے مضامین سے

گزرتے ہوئے قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ایک علمی سفر پر ہے جہاں ہر موڑ پر نئی بصیرتیں اس کا انتظار کر رہی ہیں۔

احمد امتیاز کا ایک اور امتیاز ان کا معتدل اور متوازن لب ولہجہ ہے۔ وہ تنقید میں جارحیت یا جذباتیت سے گریز کرتے ہیں۔ ان کا مقصد محض رد وقبول نہیں بلکہ معروضی مطالعہ اور فہم کی ترسیل ہے۔ ان کی تحریر میں ذاتی رائے اور علمی تجزیہ اس خوش اسلوبی سے ہم آہنگ ہوتے ہیں کہ قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

اس ضمن میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ 'امتیازات' نہ صرف اردو ادب کے طالب علموں کے لیے مفید ہے بلکہ اساتذہ، محققین اور عمومی قارئین کے لیے بھی یکساں طور پر سودمند ہے۔ اس کے مضامین میں موضوعاتی تنوع اور فکری گہرائی اس کتاب کو نصابی سطح سے بلند کر کے ایک ادبی دستاویز کی حیثیت عطا کرتے ہیں۔

آخر میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ احمد امتیاز نے 'امتیازات' کے ذریعے اردو تنقید میں جو فکری اضافہ کیا ہے وہ قابلِ تحسین اور لائقِ مطالعہ ہے۔ ان کی تحریر نہ صرف نئی نسل کے نقادوں کے لیے ایک مثال ہے بلکہ موجودہ تنقیدی منظرنامے میں ایک مثبت اور پائیدار رجحان کی نمائندہ بھی ہے۔

***

رؤف صادق کی کتاب 'ہم اپنے تماشائی' کا اجرا

(بقیہ صفحہ 5 سے آگے)

عکاسی نمایاں ہے۔ ڈاکٹر محمد کلیم ضیا نے رؤف صادق کو انوکھے اور قابلِ توجہ افسانچے رقم کرنے پر مبارکباد پیش کی اور اپنی ایک نظم سنائی جس میں رؤف صادق کے افسانچوں کے مزاج کی جھلکیاں محسوس کی جاسکتی ہیں۔ جناب شجاع الدین شاہد نے رؤف صادق کے فنِ افسانچے پر بھرپور روشنی ڈالی اور کہا کہ ان کے افسانچے فکر انگیز ہیں جس میں ندرت اور عمدگی ہے۔ ڈاکٹر وسیم عقیل شاہ نے رؤف صادق کے افسانچوں کا موضوعاتی مطالعہ پیش کرتے ہوئے ان کے افسانچوں کو کثیر رنگی قرار دیا۔ جناب علیم الدین علیم نے رؤف صادق کا دل چسپ تعارفی خاکہ پیش کیا۔ تقریبِ رسمِ اجرا کے کنوینر جناب شاذ رمزی نے نظامت کے فرائض بہ حسن و خوبی انجام دیے اور رؤف صادق کے لیے ایک نظم 'رؤف صادق سے میں ملا ہوں' پُر اثر انداز میں پیش کی۔ جناب رؤف صادق نے اپنی جوابی تقریر میں کہا کہ افسانچہ لکھنا ایک مشکل اور پیچیدہ عمل ہے لیکن ان کے لیے اللہ کے فضل خاص سے یہ مرحلہ آسان ہوا ہے۔ انھوں نے شریکِ تقریب تمام حضرات اور کتاب کی اشاعت کے دوران تعاون کرنے والی شخصیات کا بھی شکریہ ادا کیا۔ مہمانان اور جناب رؤف صادق کی شال پوشی کی گئی اور پُر تکلف عشائیے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس تقریبِ اجرا میں علاقہ مالونی ملاڈ ممبئی کی ادب نواز شخصیات نے شرکت کی۔ ☆☆

لالہ بھاری لال

(بقیہ صفحہ 2 سے آگے)

داخل کیے گئے اور ذریعۂ تعلیم بھی انگریزی ہی رکھا گیا۔ نیز کالج کے تیئیسویں سال 1870 میں ہندستانی طلبہ بھی تدریس میں شریک کیے جانے لگے۔ (ص 185) یہ بھی لکھا ہے کی اس برس ہی یعنی 1870 میں کالج انتظامیہ کو ہندستانی زبانوں میں نصابی کتب کی اشاعت کے لیے پریس قائم کرنے کی ضرورت پڑی۔ (ایضاً)

یہ دونوں باتیں درست نہیں ہیں۔ ہندستانی طلبہ پہلے دن سے کالج میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ان کی نصابی کتب اردو میں تالیف کی جا رہی تھیں اور کالج کا اپنا پریس 1850 کی دہائی کے اولین برسوں میں ہی اپنا کام شروع کر چکا تھا۔

اس کے علاوہ انھوں نے لکھا ہے: نصاب کی کتابوں کا ترجمہ اردو میں کرنے کے لیے ایک ترجمہ کمیٹی مقرر کی گئی، جس کی قیادت اس کالج کے پرنسپل اے۔ ایم۔ برینڈ رتھ نے کی اور میجر فائر بریس اس کے نگراں مقرر کیے گئے۔ (ایضاً) لیکن اس اہم بات کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔

کالج کی تالیفات کے حوالے سے انھوں نے بیش تر جگہوں پر خواجہ صاحب کی معلومات کو ہی دہرا دیا اور خواجہ حمید الدین شاہد کی ذکر کردہ سات کتب کا ہی تذکرہ کیا ہے۔ کسی نئی تالیف کا سراغ انھیں نہیں ملا۔ (ص 95-185)

اسی طرح ابواللیث صدیقی نے 'اردو میں سائنسی ادب کا اشاریہ' میں کالج سے متعلق چار چھے سطور میں عمومی نوعیت کا پیراگراف لکھا ہے جس میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ رڑکی کالج 1857 سے پہلے قائم ہونے والے اداروں میں سے تھا۔ نیز محض اندراج کی حد تک پانچ سات کتب کا نام لکھا۔ ظاہری بات ہے کہ کالج کے محض تعارف کے لیے بھی یہ ابتدائی معلومات کافی نہیں ہیں۔

مرزا حامد بیگ نے 'اردو ترجمے کی روایت' میں رڑکی کالج کے عنوان کے سامنے 1856 لکھا ہے۔ (ص 153) اس کے علاوہ یہ بھی لکھا ہے کہ 1947 تک کالج میں مسلمانوں کا داخلہ تقریباً ناممکن تھا۔ (ص 154) نیز 'کتابیاتِ تراجم' جلد اول میں جن چند ایک کتب کی فہرست سازی کی ہے، وہاں رڑکی کالج کے ساتھ 'دکن' لکھا ہے۔ (ص 36، 38، 141)

یہ تینوں باتیں درست نہیں ہیں۔ کالج کا قیام 1847 میں عمل میں آیا تھا اور کبھی بھی کالج میں مسلمانوں کے داخلے پر پابندی نہیں رہی۔ 'کالج کیلنڈر 72-1871' میں کالج میں تب تک داخل ہونے والے طلبہ کی مکمل فہرستیں دی گئیں ہیں۔ ان فہرستوں کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ ہندو اور مسلمان طلبہ کی تعداد تقریباً یکساں تھی۔ نیز کالج کا اپنی ابتدائی اڑھائی تین دہائیوں میں دکن سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔

(باقی آئندہ)

صحافت کا بحران: چیلنجز اور راہِ عمل

(بقیہ صفحہ 8 سے آگے)

حیثیت سے اس المناک صورتِ حال کا مشاہدہ کر رہی ہے۔ اگر شعر میں تحریف کی گنجائش ہوتی تو سیاست کی جگہ صحافت کا لفظ لا کر یہاں کی صحافت پر تبصرہ کرتے ہوئے میں شاد عارفی کا شعر اس طرح ادا کرتا:

ہمارے ہاں کی صحافت کا حال مت پوچھو
گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ صحافت کے زوال اور بحران کے اس تشویشناک دور میں بھی کچھ مردانِ حُر نے سوشل میڈیا کے واسطے سے ہی سہی، لیکن صحافت کو زندہ کرنے اور اس کے معیار کو برقرار رکھنے کی قابلِ قدر کوششیں کی ہیں اور کر رہے ہیں۔ تاہم ان کی تعداد اتنی کم ہے کہ اس سے عوامی صورتِ حال کی تبدیلی کی توقع نہیں رکھی جاسکتی، لیکن سوال یہ ہے کہ: آخر عمومی صورتِ حال کی تبدیلی ممکن ہے یا نہیں؟ اگر ممکن ہے تو کیسے؟

ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب دینا آسان نہیں ہے، اس لیے کہ حالات کی ستم ظریفی نے اس معاملے کو بے انتہا حساس اور مستقل غور و خوض کا موضوع بنا دیا ہے۔ کاش کہ ملک کے بااثر اور جمہوریت پسند اشخاص اس موضوع پر غور وخوض کرتے۔ میرا خیال ہے کہ غور وخوض کے نتیجے میں کئی راہیں نکل سکتی ہیں۔ اگر ملک کے بااثر اور جمہوریت پسند اشخاص چاہ لیں تو ایسے فورم بنائے جاسکتے ہیں جن کے واسطے سے صحافیوں کو نہ صرف اپنی پیشہ ورانہ دیانت داریاں برقرار رکھنے کی تربیت دی جاسکتی ہے بلکہ اس فورم کے واسطے سے عوام میں میڈیا لٹریسی کو بھی عام کیا جاسکتا ہے۔ ساتھ ہی حکومت پر دباؤ بنایا جاسکتا ہے کہ وہ میڈیا کی آزادی کی ضمانت دے اور صحافیوں کو تحفظ فراہم کرے۔ اس کے علاوہ صحافتی اداروں پر احتسابی نظام نافذ کیا جاسکتا ہے، لیکن یہ کام بھی ملک سے محبت کرنے والے جمہوریت پسند اشخاص سے جان و مال کی قربانی اور بہتر منصوبہ بندی کا مطالبہ کرتا ہے۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ اگر اس منصوبے پر ایمانداری کے ساتھ عمل ہو جائے تو جستہ جستہ ملک اور باشندگانِ ملک کا مزاج مثبت ہوسکتا ہے۔ البتہ چوں کہ مسلمان اس ملک میں میڈیائی تعصب کا نشانہ زیادہ ہوتے ہیں، اس لیے انھیں الگ سے بھی اس پہلو پر غور کرنے کی ضرورت ہے، ایسا نہیں ہے کہ اس موضوع پر غور وخوض نہیں کیا گیا ہے۔ منصوبے بھی بنائے گئے ہیں اور بڑے میڈیا ہاؤس تک قائم کرنے کی باتیں بھی ہوئی ہیں، لیکن اب تک کوئی نتیجہ ظاہر نہیں ہوسکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک سوشل میڈیا کے لیے ڈھنگ کی کوئی منظم اور مضبوط ٹیم بھی نہیں بنائی جاسکی ہے حالاں کہ جتنی بڑی بڑی مسلمانوں کی تنظیمیں ہیں، اگر ان کی باڈیز پر غور کیا جائے تو یہ سارے کام بہت چھوٹے نظر آتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ بعض مسلم نوجوانوں نے سوشل میڈیا کے مختلف پلیٹ فارموں کے واسطے سے صحافت میں اپنی موجودگی درج کرائی ہے جس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن یہاں بھی معاملہ ایک دائرے میں رہ کر عمومی بدلاؤ کی فکر کا ہے جو اُسی وقت زمین پر نظر آسکتا ہے جب ان نوجوانوں کو تنظیمی اور عوامی تعاون حاصل ہو۔ میرا خیال ہے کہ اگر مسلمانوں کی اہم تنظیمیں میڈیائی پروپیگنڈے کے خلاف متحدہ لائحۂ عمل طے کریں، اور اپنی فضول خرچیوں پر قابو پا کر باضابطہ پیشہ ور صحافیوں سے تعاون لیں تو نہ صرف اچھی صحافت کے لیے ایک اچھا پلیٹ فارم دستیاب ہوسکتا ہے بلکہ سوشل میڈیا کا بھی بہترین استعمال ہوسکتا ہے، جس کے اثرات سے جستہ جستہ ہی سہی لیکن ملک کی فضا سازگار ہوسکتی ہے:

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہوجا
خودی کا رازداں ہوجا خدا کا ترجماں ہوجا
(علامہ اقبالؔ)

(بہ شکریہ ہفتہ وار 'نقیب' پھلواری شریف، پٹنہ)

اردو ہندی ڈکشنری
انجمن ترقی اردو (ہند)
قیمت: 300 روپے

اسٹینڈرڈ انگلش اُردو ڈکشنری
مولوی عبدالحق
قیمت: 500 روپے

صحافت کا بحران چیلنجز اور راہِ عمل

مولانا شمیم اکرم رحمانی

صحافت عربی زبان کا لفظ ہے، جو مادہ 'ص، ح، ف' سے ماخوذ ہے، اسی مادّے سے 'صُحُف'، 'صحیفہ' اور 'صحافت' جیسے الفاظ بھی وجود میں آئے ہیں، جن کے مفہوم میں کتاب، رسالہ اور تحریری صفحہ جیسے معانی شامل ہیں۔ انگریزی زبان میں 'جرنلزم' (Journalism) کو 'صحافت' کا مترادف سمجھا جاتا ہے۔ اگر اصطلاحی تعریف کی بات کی جائے تو صحافت یا جرنلزم دراصل ایسے عمل کا نام ہے جس کے ذریعے قارئین، سامعین یا ناظرین تک خبریں، تجزیے، خیالات اور جذبات پہنچائے جاتے ہیں، اسی لیے وہ تمام سرگرمیاں جو خبر رسانی، تجزیہ نگاری یا نظریات و جذبات کے اظہار میں معاون ہوں، صحافت کے دائرے میں شامل سمجھی جاتی ہیں اور جو افراد ان ذمے داریوں کو طے شدہ اصولوں، پیشہ ورانہ تقاضوں اور اخلاقی حدود کے اندر رہ کر انجام دیتے ہیں وہ بجا طور پر 'صحافی' کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں۔

صحافت، میڈیا اور ذرائعِ ابلاغ کی اصطلاح گرچہ بہت زیادہ قدیم نہیں ہے لیکن صحافت، میڈیا اور ذرائعِ ابلاغ کا تصور بہت قدیم ہے۔ اگر کوئی مورخ صحافت کی ابتدائی تاریخ کی تحقیق کرے گا تو اس کی تحقیق اسے انسان کے ابتدائی عہد میں پہنچا دے گی، جہاں حضرت آدم علیہ السلام اللہ کے پیغام سے اپنی قوم کو باخبر کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ دراصل اس سچائی سے انکار ممکن نہیں ہے کہ صحافت کا آغاز الہام سے ہوا ہے۔ وقت کے ساتھ اس نے الہام سے اخبار، اخبار سے ٹیلی ویژن، اور ٹیلی ویژن سے سوشل میڈیا تک کا سفر طے کیا ہے، الہام سے سوشل میڈیا تک کے سفر کی روداد کم دل چسپ نہیں ہے۔ تاریخی واقعات شہادت دیتے ہیں کہ اخبارات کے وجود سے قبل لوگ کبھی پرندوں کو استعمال کر کے، کبھی اونچی جگہوں سے آواز لگا کر، کبھی آگ روشن کر کے، کبھی پمفلٹوں کو دیواروں پر چسپاں کر کے اور کبھی خطوط بھیج کر پیغام رسانی کے فرائض انجام دیتے تھے۔ بادشاہوں، نوابوں یا حاکموں کے احکامات اور اعلانات منادی کے ذریعے عام کیے جاتے تھے۔ مصر، یونان اور چین میں سرکاری فرامین عوام تک پہنچانے کے لیے مخصوص نظام قائم تھے۔ تحقیق سے پتا چلتا ہے کہ چین میں تانگ خاندان کے دور (آٹھویں صدی) میں Kaiyuan Za Bao نامی سرکاری خبرنامہ جاری ہوتا تھا۔ اگر سلطنتِ مغلیہ کی بات کی جائے تو عہدِ مغلیہ میں بھی 'واقعہ نویس' اور 'خبردار' نامی عہدیدار موجود تھے جو روزانہ یا ہفتہ وار بنیاد پر بادشاہوں کو اطلاعات پہنچاتے تھے، لیکن 1450 کا سال ایجادات کی دنیا میں ایک انقلاب لے کر آیا اور پرنٹنگ پریس (چھاپہ خانہ) کا وجود ہوا۔ مشہور جرمن موجد یوہانس گوٹن برگ کی اس ایجاد کے نتیجے میں کتابیں عام آدمی کی رسائی میں آنے لگیں، اور پھر دنیا نے وہ وقت بھی دیکھا جب 1605 میں جرمنی کے شہر اسٹریسبرگ سے دنیا کا پہلا باقاعدہ پرنٹ اخبار Relation شائع ہوا۔ گویا کہ چھاپہ خانے کی ایجاد صحافت کی تاریخ کا سب سے اہم موڑ ہے جہاں سے صحافت نے کافی تیز رفتار ترقی کی، اور معاملہ یہاں تک پہنچا کہ نہ صرف ریڈیو، ٹیلی ویژن بلکہ دنیا نے سوشل میڈیا تک کا دور دیکھا۔ مجھے معلوم نہیں ہے کہ صحافت سوشل میڈیا سے آگے کہاں تک سفر طے کرے گی، لیکن جہاں تک بھی سفر کرے، صحافت کا مقصد وہی رہے گا جو پہلے تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ صحافت کا کیا مقصد ہے؟ ظاہر ہے اس سوال کے مختلف جوابات دیے گئے ہیں اور دیے جاسکتے ہیں۔ تاہم مختصر الفاظ میں اگر بات کی جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ صحافت کا مقصد لوگوں کو سچی خبروں سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ عصرِ حاضر کے واقعات کا تجزیہ کرنا، اس کے پس منظر کو واضح کرنا اور انصاف کے ساتھ ایک نتیجہ نکال کر عوام کے سامنے رکھنا بھی ہے، تاکہ رائے عامہ کی تشکیل کا صحیح راستہ صاف ہو، اس لیے کہ صحافت محض رائے عامہ کی ترجمان نہیں ہوتی ہے بلکہ رائے عامہ کی رہنمائی کا فریضہ بھی سرانجام دیتی ہے، جس کے صاف معنی یہ ہوئے کہ عوامی شعور بیداری کے ساتھ ساتھ انصاف کے تقاضوں کے مطابق سماج کی اور حکومت کی پالیسیوں کی نگرانی صحافتی سرگرمیوں کا لازمہ ہے، جس کے بغیر صحافت سانس بھی نہیں لے سکتی ہے، اسی لیے ایک صحافی کے لیے جہاں ایماندار ہونا، تعلیم یافتہ ہونا، تحقیقی مزاج کا حامل ہونا اور غیر جانبدار ہونا ضروری ہے وہیں اس کا بے انتہا جرأت منداور باحوصلہ ہونا بھی ضروری ہے۔

اگر صحافت کے اس پورے فلسفے کو ذہن میں رکھا جائے تو اس سوال کا جواب بڑی آسانی سے مل جاتا ہے کہ ایک صحافی معاشرے کی تعمیر اور تخریب میں کتنا بڑا کردار ادا کرسکتا ہے، اسی لیے صحافت کی اہمیت پر پوری دنیا کا اتفاق ہے۔ اور نہ صرف اس دنیا کے جمہوری نظام نے اسے چوتھا ستون قرار دیا ہے بلکہ مذہبِ اسلام نے بھی اسے مختلف انداز سے مرکزِ توجہ بنایا ہے، اور اس کے کئی اہم اور ضروری اصولوں کی نشاندہی کی ہے، جن میں سچ کی تبلیغ، جھوٹ کی حوصلہ شکنی، اخلاقی اقدار کا فروغ، خبروں کی تحقیق، حکومتوں اور امرا کا محاسبہ اسلامی صحافت کے اہم عناصر ہیں جن کے بغیر صحافت کا بھی وجود نہیں ہوسکتا، چہ جائیکہ اسلامی صحافت کا وجود ہو۔ یہی وجہ ہے کہ صحافتی اداروں کی کمی تو اس دنیا میں نہیں ہے لیکن صحافت ڈھونڈنے سے خال خال ہی نظر آتی ہے۔

شرمناک بات ہے کہ زمانے کے نشیب و فراز نے صحافت کو محض ایک پیشہ بنا دیا ہے لیکن صحافت کے آغاز، ارتقا اور مقاصد پر غور کرنے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ صحافت محض ایک پیشہ نہیں ہے بلکہ ایک مقدس فکری، اخلاقی اور تمدنی مشن ہے جس کے بہت سے تقاضے ہیں۔ اگر یہ تقاضے پورے نہ کیے جائیں تو صحافت، صحافت نہیں کچھ اور بن جاتی ہے جس کے نتیجے میں فطری طور پر ایک ایسا تخریبی سماج تشکیل پاتا ہے جو فکری، عملی، معاشی اور معاشرتی کمزوریوں سے جھوجھتا ہے۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہو رہی ہے کہ اپنے ملک بھارت میں بھی صحافت گذشتہ کئی برسوں سے اپنے مقاصد سے مکمل منحرف ہے، اور زعفرانی ذہنیت کے ساتھ 'گودی میڈیا' بن کر کام کر رہی ہے۔ ٹی وی چینلوں سے لے کر اخبارات تک کے حالات ناگفتہ بہ ہیں۔ زیادہ تر صحافتی ادارے غیر جانب دار رپورٹنگ کے بجائے کسی خاص سیاسی جماعت یا بعض سرمایہ دار طبقے کے ایجنڈے کو فروغ دینے میں مصروف نظر آتے ہیں، اسی لیے صحافتی ادارے ناخواندگی، بھوک مری، بے روزگاری، مہنگائی، عصمت دری، نشہ خوری اور خودکشی جیسے سیکڑوں سنگین عوامی مسائل کو چھوڑ کر ان بحثوں کو مرکزِ توجہ بنانے میں لگے ہوئے ہیں جن سے اکثریتی طبقے کے مذہبی جذبات بھڑکیں اور مخصوص سیاسی جماعت کے ناجائز ایجنڈے کو تقویت حاصل ہو۔ ساتھ ہی انھیں نہ حکومت کے جبر کا سامنا کرنا پڑے اور نہ اشتہار کی بندش کا خوف ہو۔ چناں چہ 'گھر واپسی'، 'لو جہاد'، 'کورونا وائرس'، 'این پی آر'، 'این آر سی' جیسے تمام موضوعات پر یہاں کے صحافتی اداروں اور صحافیوں نے اسی مفاد پرستانہ اور بزدلانہ ذہنیت کے ساتھ صحافت کی ہے، جو صحافت کی تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے۔ آخر اس سے زیادہ شرمناک بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ آئینی طور پر تو یہاں صحافت کی آزادی محفوظ ہے، لیکن عملی طور پر ہر گزرتے دن کے ساتھ یہاں کی صحافت کا معیار گرتا جا رہا ہے۔ ورلڈ پریس فریڈم انڈیکس 2024 کے سروے کے مطابق 'بھارت صحافت کی آزادی کے لحاظ سے 180 ممالک کی فہرست میں 1059 ویں نمبر پر ہے'۔ اس دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت میں صحافت کا گرتا ہوا یہ معیار جمہوریت پر یقین رکھنے والوں کے لیے بہت پریشان کن ہے۔ مزید پریشان کن بات یہ ہے کہ عوام تماشہ بینوں کی ...(بقیہ صفحہ 7 پر)

ادارے کا مضمون نگاروں کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے (ادارہ)

مدیر : **اطہر فاروقی**
Editor : Ather Farouqui
شریکِ مدیر : محمد عارف خاں
Joint Editor : Mohd. Arif Khan
پرنٹر پبلشر : عبدالباری
Printer Publisher : Abdul Bari
مطبوعہ : جاوید پریس، 2096، رودگراں، لال کنواں، دہلی-۶
مالک : انجمن ترقی اردو (ہند)
اردو گھر، 212، راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002
Proprietor:
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue,
New Delhi-110002
قیمت : فی شمارہ: پانچ روپے، سالانہ: 200 روپے
بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر
Subscription: (Per Issue): Rs. 5/-, Annual: 200/-
(Foreign Countries: US $ 8)
E-mail: hamarizaban.weekly@gmail.com
http://www.atuh.org,
Phones: 0091-11-23237722

Printed and Published by ***Abdul Bari*** on behalf of Anjuman Taraqqi Urdu (Hind), Urdu Ghar, 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002
and Printed at Javed Press, 2096, Rodgran, Lal Kuan, Delhi-110006, Editor: ***Dr Ather Farouqui***